حیات بعد از موت

الحاج سید امتیاز حیدر اختر

حیات بعد از موت

مُصنّف

الحاج سیّد امتیاز حیدر اختر
پترابگڈھی

ناشر

عبّاس بُک ایجنسی
رستم نگر، درگاہ حضرت عبّاس لکھنؤ ۳
فون: 260756

نام کتاب: حیات بعد از موت

مصنف: سید امتیاز حیدر اختر

کتابت: غضنفر رضوی

سنہ طباعت: ستمبر ۱۹۹۷ء

تعداد: ایک ہزار (۱۰۰۰)

سرورق: عباس حسنین

ناشر: عباس بک ایجنسی
رستم نگر، درگاہ حضرت عباس، لکھنؤ

قیمت: پینتیس (۳۵) روپے

ملنے کے پتے

عباس بک ایجنسی لکھنؤ — فون نمبر:- 260756

ادارۂ اصلاح لکھنؤ — فون نمبر 261956

انتساب

• اُس قادرِ مطلق کے نام:

جس سے میں نے طاقت مانگی۔ تاکہ کوئی کارنامہ انجام دے سکوں۔
—— اُس نے مجھے کمزوری عطا کی۔ تاکہ فرماں برداری کر سکوں۔

• اُس خالقِ یکتا کے نام:

جس سے مَیں نے چیزیں مانگیں۔ تاکہ زندگی کا لطف اُٹھا سکوں۔
—— اس نے مجھے زندگی عطا کی۔ تاکہ چیزیں حاصل کر سکوں۔

• اُس حکیمِ لاثانی کے نام:

—— جو تشنۂ پرواز کو اس وقت تک موت نہیں دیتا
جب تک وہ
اپنی صلاحیتوں کی بلند ترین منزلوں پر نہیں پہنچ جاتا۔

—— ایک ناچیز و گنہگار بندہ

سید امتیاز حیدر اختر

(پرتاب گڈھ)

عرضِ ناشر

قرآنی صراحت کے مطابق حقیقی اور ابدی زندگی وہی ہے، جو موت کے بعد انسان کو میسّر ہوتی ہے۔ اس حقیقت کا تصوّر سب سے پہلے، تیسری صدی ہجری کے اوّلین پچاس برسوں کے درمیان احمد بن یحییٰ اصفہانی کے ذہن میں ابھرا، جو مختلف علوم کی وادیوں سے گزرنے کے بعد "ابن راوندی" کے نام سے مشہور ہوا۔

"ابن راوندی" ایک بلند پایہ عالم، عظیم فلسفی، ممتاز ریاضی داں اور علوم طب و حکمت کا ماہر تھا۔ لیکن یہ شخص اپنی موت سے تقریباً دس سال پہلے اسلامی اصولوں اور خدا کے وجود سے انحراف کر کے مشرک و ملحد ہو گیا تھا۔ اس نے اپنی علمی استدلال کی بنیاد پر موت کے بارے میں جو عالمانہ نظریہ عباسی خلیفہ متوکل کے دربار میں پیش کیا تھا وہ حسب ذیل نکات پر مبنی ہے۔

(۱) دُنیا کا کوئی انسان اس سربستہ راز کی تہہ تک نہیں پہنچ سکتا کہ موت کیونکر واقع ہوتی ہے، جب تک وہ موت کو خود اپنے اوپر نہ آزمائے ـــــ دوسروں کی موت کے مشاہدے سے انسان اس کے بارے میں یہ نظریہ نہیں قائم کر سکتا کہ موت کی حقیقت کیا ہے؟ اور وہ کیسی ہوتی ہے؟

(۲) کوئی بھی شخص اپنے آپ کو مردہ نہیں سمجھ سکتا۔ اس لئے کہ انسان جب تک زندہ ہے اس کے لئے یہ امر محال ہے کہ وہ خود کو مردہ تصور کرے۔ کیونکہ اگر اسے یقین اور علم اس بات کی دلیل ہے کہ وہ زندہ، اگر زندہ نہ ہوتا تو اسے مرنے کا علم

کیونکر ہوتا۔

(۳) کسی مُردے کو اس بات کا علم نہیں ہوتا کہ وہ مُردہ ہے۔ اگر مردہ شخص یہ جان لے کہ وہ مُردہ ہے تو اس صورت میں وہ مُردہ نہیں ہوگا۔ کیونکہ مُردہ شخص میں اپنے آپ کو پہچاننے کا شعور نہیں ہوتا۔ شعور زندہ لوگوں کی صفات میں ہے۔ عام عقیدہ کے برخلاف مُردہ شخص یہ نہیں دیکھ سکتا کہ اس کے رشتے دار اس کے سرہانے کھڑے رو رہے ہیں۔ اگر وہ دیکھ لے، ان کی گریہ وزاری کو سُن لے یا محسوس کرلے یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ زندہ ہے۔ اگر وہ مُردہ ہوتا تو وہ یہ نہ جان سکتا کہ وہ مردہ ہے اور نہ ہی اپنے اِردگرد کھڑے لوگوں کو دیکھ یا انکی آوازیں سُن سکتا۔

ابن راوندی کے یہ نظریات اس کے اپنے زمانے یعنی تیسری صدی ہجری کے اوائل میں قابلِ توجہ تھے لیکن امام جعفر صادق علیہ السّلام نے اپنے روحانی اقتدار کے زمانے میں موت کی حقیقت پر جو تبصرہ فرمایا ہے، وہ قیامت تک پیدا ہونے والے مفکروں، دانشوروں، فلسفیوں اور سائنس دانوں کے لئے مشعل راہ ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ:۔

"احمق لوگ موت کو خدا کی طرف سے انسان پر ایک ظلم عظیم تصوّر کرتے ہیں، حالانکہ موت میں بھی اس کی ایک مصلحت کارفرما ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر موت نہ ہوتی تو انسانی معاشرہ ختم ہو گیا ہوتا۔ آیندہ دور کے سائنسدانوں کے حق میں میری یہ وصیت ہے کہ مَوت کو جھٹلانے یا ختم کرنے کی کوشش نہ کریں کیونکہ اگر مَوت ختم ہو گئی تو نسل انسانی تباہ و برباد ہو جائے گی۔"

مزید وضاحت کے ذیل میں آپ نے فرمایا:۔

"اگر موت کے تصوّر سے الگ ہٹ کر انسان کو یہ یقین ہو جائے کہ وہ ہمیشہ

زندہ رہے گا تو جو ظالم لوگ ہیں وہ دوسروں کا مال ہڑپ کرنے کی کوشش کریں گے تاکہ وہ اپنی لامحدود زندگی میں ہمیشہ دولت کے مالک بنیں رہیں اور جب ایسا ہوگا تو مظلوم اور کمزور لوگ اپنے اموال کو بچانے کے لئے متحد ہو کر غاصب ظالموں سے مقابلہ کریں گے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ ظالم لوگ اپنے ظلم اور طاقت کی بنیاد پر کمزوروں کو ختم کر دیں گے حالانکہ یہ موت فطری نہیں ہوگی"۔

ایک دوسرے مقام پر آپ کا ارشاد ہے کہ:۔

"حقیقی اور ابدی زندگی وہی ہے جو موت کے بعد اللہ کی طرف سے انسان کو عطا ہوتی ہے، موت کا ظاہری وجود تو صرف اس لئے ہے کہ لوگ اللہ سے خوف کھائیں اور اس سے ڈرتے رہیں"۔

امام جعفر صادق علیہ السّلام کا یہ قول اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ انسان کی حقیقی اور ابدی زندگی دراصل وہی ہے جو موت کے بعد شروع ہوتی ہے اور جس کے آخری لمحات قیامت کے ابتدائی لمحات سے منسلک ہوتے ہیں۔

یہی وہ اہم نقطہ ہے جو برادرم سید امتیاز اختر پرتاب گڑھی کی تحقیق و جستجو کا مرکز و محور ہے اور زیر نظر کتاب میں اسی نقطہ کی بنیاد پر موت کے بعد زندگی کی حقیقت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ امید ہے کہ یہ استدلال کتاب قارئین کرام کے لیے ایک گراں قدر تحفہ ثابت ہوگی۔

احقر العباد

سید علی عبّاس طباطبائی

عبّاس بک ایجنسی، درگاہ حضرت عبّاس رستم نگر، لکھنؤ

توثیق

علامہ سید ذیشان حیدر جوادی

بسمہٖ سبحانہٗ

اسلام کی بنیادی تعلیم جس کا مصیبت کے مواقع پر بھی یاد رکھنا ضروری ہے۔ "اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون" ہے اور یہ حقیقت انسان کے ذہن میں اس وقت راسخ ہو سکتی ہے جب اس کا ایمان "حیات بعد الموت" پر ہو۔

حیات بعد الموت کا عقیدہ اسلام و کفر کے درمیان حد فاصل ہے جہاں کفارِ مکہ یہ نعرہ بلند کر رہے تھے کہ "ہمیں اس دنیا میں جینا ہے اور یہیں مر جانا ہے۔ زمانہ ہمیں ہلاک و برباد کر دے گا اور اس کا کوئی مستقبل نہیں ہے" اور اس کے جواب میں عقیدہ معاد کے مسلسل دلائل پیش کر رہا تھا اور جمادات و نباتات سے لے کر کواکب و سیّارات تک سب کے وجود کو اس عقیدہ کے شواہد اور دلائل کے طور پر پیش کر رہا تھا۔

موضوع انتہائی اہم ہے اور اس پر تحریک عمل تنظیم حیات کے ساتھ جزا و سزا کا دارومدار ہے لیکن افسوس یہ ہے کہ ہمارے ملک میں تقریر و تحریر دونوں میدانوں میں اس موضوع کو بڑی حد تک نظر انداز کیا گیا ہے۔

چند رسائل ضرور منظر عام پر آئے ہیں لیکن موضوع کا حق یقیناً ادا نہیں ہو سکا ہے۔ عربی اور فارسی زبان میں دیگر موضوعات کی طرح اس موضوع پر بھی کافی مواد پایا جاتا ہے

اور آخری دور میں آیتہ اللہ مکارم شیرازی دام ظلہٗ۔ آیتہ اللہ مظاہری دام ظلہ وغیرہ نے بڑی تفصیل کے ساتھ اس موضوع پر بحث کی ہے اور آیتہ اللہ دستغیب طاب ثراہ نے تو اپنی تحریر و تقریر میں اس موضوع کو سب سے زیادہ اہمیت دی ہے اور اس کے ذریعہ ایک مکمل اسلامی ذہن اور مزاج پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

اردو زبان میں ایک عرصہ سے یہ موضوع تشنہ توضیح ہو کر رہ گیا تھا۔ خدا جزائے خیر دے جناب محترم امتیاز حیدر صاحب پرتابگڈھی کو کہ انہوں نے اس سنگلاخ وادی میں قدم رکھا اور نہایت آسانی کے ساتھ گذر گئے۔ اب اس کی بنیاد وہی خواب ہے جس کا انہوں نے حوالہ دیا ہے یا کوئی اور توفیق پروردگار ہے۔ یہ مالک ہی بہتر جانتا ہے۔ لیکن کام بہت عظیم اور مفید ہوا ہے اور چونکہ موصوف رسمی طور پر اس علمی لائن کے نہیں ہیں لہٰذا ان کا یہ کارنامہ صاحبانِ علم و فضل کے لئے دعوتِ فکر و عمل بھی ہے۔

تنگی وقت کی بنا پر حقیر کو کتاب کے تفصیلی مطالعہ کا موقع نہیں مل سکا لیکن عناوین سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ موضوع کے بیشتر جہات کا احاطہ کر لیا گیا ہے اور مؤلف کے شرف کے لیے یہی بات کافی ہے۔ باقی کام دیگر حضرات اہلِ علم انجام دیں گے کہ قیامت میں سبھی کو حاضر ہونا ہے اور اپنے اپنے نامہ اعمال میں سبھی کو خدمت دین کا عمل ثبت کرانا ہے۔

و آخر دعوانا ان الحمد للہ ربّ العالمین ـــــ والسّلام علیٰ من اتبع الھدیٰ

جوادی

۹ ذوالقعدہ ۱۴۱۷ھ

نمبر شمار	فہرست مضامین	صفحہ نمبر

پیش لفظ

ایک تشنۂ علم حیات و ممات۔ ایک جویائے رموز کائنات جب اپنے چاروں طرف بکھری ہوئی زندگیوں پر غور کرتا ہے تو محوِ حیرت ہو کر رہ جاتا ہے۔ زندگیاں۔ انواع و اقسام کی زندگیاں۔ انسانوں اور حیوانوں کی شکلوں میں متحرک زندگیاں۔ درختوں اور نباتات کی شکلوں میں ساکت زندگیاں۔ سنگ ریزوں اور پتھر کی شکلوں میں جامد زندگیاں۔ فضا میں پرواز کرتی ہوئی زندگیاں۔ پانی میں ڈوبتی ابھرتی ہوئی زندگیاں۔

یہ زندگیاں اور کائنات کی یہ نیرنگیاں جو دیکھنے میں غیر منظم اور بے ربط لگتی ہیں حقیقت میں ایک انتہائی منظم اور مربوط نظام کے تحت پابند عمل ہیں۔ ہر ظاہری بدنظمی میں ایک مضبوط نظام اور ہر ظاہری بے ترتیبی میں ایک مربوط استحکام ہے۔

کائنات کی کوئی شے مہمل اور بے کار نہیں ہے اور انسان اس سلسلۂ حرکت و عمل میں ایک اہم کڑی کا کام کر رہا ہے۔ اس جامع اور منظم گردش کائنات اور اس مربوط نظام کائنات میں ایک ذرہ ناچیز سے لے کر عظیم سیاروں تک مشین کے چھوٹے بڑے پرزوں کی طرح اس قدر مربوط ڈھنگ سے جڑے ہوئے ہیں کہ اگر ان میں کا ایک چھوٹا سا حقیر پرزہ یا اسکرو اپنی جگہ سے ہٹ جائے یا کم ہو جائے تو سارا نظام اسی مشین کی طرح درہم برہم ہو جائے۔

یہ کواکب۔ یہ سیارے۔ یہ چاند اور ستارے۔ جذب باہمی کی ڈور میں بندھے ہوئے اپنی کشش مرکزی کے چاروں طرف مقررہ رفتار، مقررہ حرکت کے ساتھ مقررہ فاصلہ قائم

رکھ کر ایک مقررہ اور معینہ مدت تک کے لئے رواں دواں ہیں۔ اور ہماری یہ دنیا بھی انھیں میں کی ایک ہے۔

ایک جویائے اسرار کائنات۔ جب تاریک راتوں میں کہیں اکیلی گزرگاہوں یا پرسکون مرغزاروں سے گزرتے ہوئے نیلگوں آسمانوں پر چمکتے ہوئے ستاروں کو دیکھتا ہے تو تخلیقات کے تانے بانے میں کھوکر وہ خود کو ان کروڑوں اور اربوں ماہ پاروں کے درمیان پاتا ہے۔ وہ یہ بھی محسوس کرتا ہے کہ کائنات کے اس لامتناہی نیلے اور سیاہ سمندر میں اپنی دنیا کے رنگین سفینہ پر وہ بھی دوسرے بے شمار فلک پاروں کے ساتھ تیر رہا ہے۔ اور پھر یہ ظاہری دوریاں ختم ہو جاتی ہیں۔ اس کے بعد وہ خود کو ان ٹمٹاتے اور آنکھ مچولیاں کرتے ماہ پاروں کے درمیان حرکت کرتا محسوس کرتا ہے۔ سفر کرتا محسوس کرتا ہے۔ کسی انجان منزل کی طرف۔ یہ سفر کہاں ختم ہوگا۔ منزل کب آئے گی۔ سفر کی انتہا کیا ہوگی۔ مسافر نہیں جانتا۔

دوسری تخلیقات کی طرح انسان بھی دنیا میں آتا ہے اور کچھ دن گزار کر چلا جاتا ہے یہی ہے حیات کی تاریخ حیات۔ یہی ہے زندگی کی روداد زندگی۔ زندگی کے لئے تین ہی الفاظ بولے جاسکتے ہیں۔ "نہیں تھا۔" "ہے" اور "نہیں رہے گا"۔ ہر تخلیق کے بس یہی تین رُخ ہیں کل نہیں تھا۔ آج ہے۔ کل نہیں رہے گا۔ یہی ہے تاریخ انسان۔ یہی ہے تاریخ موجودات اور یہی ہے تاریخ کائنات۔ "نہیں تھا۔" "ہے" اور "نہیں رہے گا" اور باقی رہے گا تو بس وہی خالق کائنات ایک ایسی ہستی جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا اور اس کے لئے "قدیم" کا لفظ ہی استعمال کیا جاسکتا ہے یعنی ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔

منکروں۔ دہریوں اور خدا کے وجود کو نہ ماننے والوں کا کہنا ہے کہ کوئی خدا

نہیں ہے۔ یہ کائنات اپنے آپ عالم وجود میں آگئی۔ اس کا کوئی بنانے والا نہیں ہے۔ اپنے آپ پیدا ہوگئیں یہ زندگیاں۔ اپنے آپ پیدا ہوگیا یہ انسان۔ بھلا کوئی ان زندیقوں سے سوال کرے۔ اِن دہریوں سے پوچھے کہ جس میں اپنے آپ پیدا ہو جانے کی طاقت تھی وہ آج ہی کیوں پیدا ہوا۔ سو سال پہلے کیوں نہیں پیدا ہوگیا۔ ہزار سال پہلے کیوں نہیں پیدا ہوگیا۔ اور پھر اگر اس میں خود بخود پیدا ہونے کی طاقت ہے تو اس میں ہمیشہ زندہ رہنے کی طاقت بھی ہونی چاہئے۔ کوئی مرنا پسند نہیں کرتا۔ تو پھر وہ مرتا کیوں ہے۔ اسکا غیر ارادی پیدا ہونا اور خلاف مرضی مر جانا اس کی مجبوری ظاہر کرتا ہے۔ اور زندگی کا ماحاصل انھیں تین لفظوں میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ "نہیں تھا"۔ "ہے" اور "نہیں رہے گا"۔

جو آیا ہے وہ جائے گا۔ ہر زندگی کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔ اور ہر تخلیق کے لئے یہی تین لفظ استعمال ہوتے رہیں گے۔ "نہیں تھا"۔ "ہے" اور "نہیں رہے گا"۔ پھر اب دوسرا نظریہ ہی قابل قبول ہوسکتا ہے۔ اس کائنات کا کوئی بنانے والا ضرور ہے۔ ایک ایسی ہستی جس کے لئے فنا نہیں ہے اور جس کے لئے قدیم کا لفظ ہی استعمال ہو سکتا ہے۔ ایک ایسی ہستی جس کو کبھی فنا نہیں ہے۔ اس کی انتہائی دلیل اگر چاہتے ہوں تو لیجئے اس خدا کا ایک دوسرا خالق مانے لیتے ہیں۔ اور پھر اس دوسرے خدا کو پیدا کرنے والا ایک تیسرا خدا۔ اس طرح آپ فرض کرتے جائیں گے۔ پھر اس کے بعد خدا۔ پھر اس کے لئے بھی ایک خدا۔ پھر اس کے لئے بھی ایک خدا۔!! اور پھر آخر میں۔ جب آپ فرض کرتے کرتے تھک جائیں گے تو وہی سب سے بعد والا خدا ہی قدیم ہوگا جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا اور جس کے لئے فنا نہیں ہے۔

اس کائنات میں زندگی اور موت کا چکر چل رہا ہے۔ آدمی پیدا ہوتا ہے جوان ہوتا ہے اور پھر پیرانہ سالی کی طرف بڑھتے ہوئے اپنی زندگی کے دن پورے کرنے کے بعد چلا جاتا ہے اور دوسرے آنے والوں کے لئے جگہ خالی کر جاتا ہے۔ کیا اس عظیم شاہکار فطرت کا جس کے سامنے ملائکہ کو بھی سجدہ ریز ہو جانے کا حکم دیا گیا انجام یہی ہے۔ گنے دنوں کی زندگی۔ چند نپی تُلی ہوئی سانس اور بس! کیا اس معجزاتی مخلوق کی زندگی کا یہی ماحاصل ہو سکتا ہے کہ وہ دنیا میں آئے۔ زندگی کے دن گزارے اس چند روزہ زندگی میں ثواب و عذاب کا مرتکب بھی ہو۔ رحم وکرم کا مجسمہ بھی ہو۔ ظلم و جبر کی کریہہ شکل بھی اختیار کرے اور پھر بلا کسی جزا یا سزا کے اس دنیا سے رخصت بھی ہو جائے تو کیا یہ عدل خداوندی سے بعید نہ ہوگا کیا یہ عجوبۂ روزگار۔ یہ مثبت اور منفی کردار اپنی دنیاوی زندگی میں کئے ہوئے نیک اعمال کا اجر نہ پائے گا! کیا ایک بدکردار اور ظالم انسان اپنے بداعمالیوں کی سزا نہ بھگتے گا! پھر اس کی اس چند روزہ اور خالی زندگی کے لئے خدا کو اس کی ربوبیت۔ اصلاح اور تربیت کی ضرورت ہی کیوں محسوس ہوئی۔ پھر اس کی رہبری کے لئے ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبرؐ اور بارہ آئمہ طاہرین کے بھیجنے کی کیا حاجت تھی! پھر اس کے علم کے فروغ اور عقل کے بلیغ ہونے کی طرف اتنی توجہ دینے کی کیا ضرورت تھی! یہ سب اسباب کی پختہ گواہیاں ہیں کہ اس زندگی کے بعد بھی زندگی ہے۔ ایک ایسی زندگی ہے جو غیر فانی ہے۔ جو لازوال ہے اور وہی ہے "حیات بعد از موت" جہاں پر اس دنیا میں کئے گئے اعمال کا مکمل۔ واضح اور مناسب بدلہ دیا جائے گا۔

میں اپنے انھیں منتشر خیالوں کے درمیان بہت دنوں سے بھٹک رہا تھا۔ کبھی صحراؤں کی خاک چھانتا رہا۔ کبھی نباتات اور اشجار کے برگ و بار سے سوال کرتا رہا۔ کبھی آبِ رواں

سے کچھ دریافت کرنے کی کوششیں کرتا رہا۔ کبھی چاند تاروں کو ہمراز بنانے کی خواہش کرتا رہا۔ کبھی کہکشاؤں کے درمیان راہیں تلاش کرتا رہا۔ دل میں تلاش کی ایک چنگاری اور ذہن میں جستجو کی ایک تپش تھی جو اکثر بیدار ہو کر حیات بعد از موت پر کچھ لکھنے کے لئے اکساتی تھی۔ مگر اپنی کوتاہ علمی اور کم مائگی ہر بار سدِ راہ بن کر سامنے آجاتی تھی۔ راہیں واضح نہیں ہو پاتی تھیں۔ دلائل نامکمل اور ادھورے سے لگتے تھے۔ نظریات بے جان سے نظر آتے تھے۔ تخیلات راستے میں ہی ساتھ چھوڑ دیتے تھے اور کامیابی کی منزل تا حد نظر معدوم تھی۔ ایک رات اپنی کم مائگی پر حسرت کے آنسو بہاتا۔ اپنی منفی صلاحیتوں کی وجہ سے اپنی خواہش نا تمام پر آہِ نارسا کا سہارا لے کر اپنی بے علمی اور کوتاہ فکری کا کفن اوڑھ کر ڈوبتے ہوئے دل کی دھڑکنیں گن رہا تھا ... عالم رویا میں میری جھکی ہوئی نظروں نے دیکھا کہ صاحبِ ذوالفقار۔ ذوالفقار لئے ہوئے کرسی نشین ہیں۔ ذوالفقار۔ ریڑھ کی ہڈی جیسی گرِیا دار اور خمیدہ۔ سیاہ رنگ کی نیام سیاہ رنگ کی نیام تقریباً چھ چھ انچ جوڑ پر سنہرے پھول۔ مزین ذوالفقار کی مزین نیام۔!! ذوالفقار دیکھنے کے بعد ذہن میں خیال آیا ذوالفقار ہو سکتی ہے تو کس کے پاس۔ ذوالفقار دیکھنے کے بعد خیال آیا صاحبِ ذوالفقار کا۔! اور پھر میری جھکی ہوئی نظریں جو اوپر کو اٹھیں دیکھا کہ امیر المومنین حضرت علیؑ کرسی پر انتہائی شان اور تمکنت کے ساتھ جلوہ افروز ہیں۔ سیاہ عبا۔ سیاہ عمامہ کتابی چہرہ۔ گھنی دراز ریش جس میں کہیں کہیں کچھ بال سفید۔ ستواں اور لمبی ناک بڑی پُرنور اور پُرکشش آنکھیں۔ مولا انتہائی توجہ اور غور سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ آپ کی پُرکشش اور مسکراتی ہوئی نگاہوں میں شفقت بھی تھی۔ التفات بھی تھا اور ساتھ ہی ساتھ۔ ایک ارشاد۔ ایک ہدایت، ایک حکم کے ساتھ ایک پرسکون حوصلہ افزائی تھی۔ ایک لمحہ کے بعد مولا کی نگاہوں کا وہ سلسلۂ ترسیل

ختم ہو چکا تھا اور میں عالمِ خواب سے عالم بیداری میں آچکا تھا۔ پھر لاکھ آنکھیں بند کیں۔ لاکھ ان خوش نصیب خوابوں کو دوبارہ سجانے کی کوششیں کیں مگر یہ ممکن نہ ہو سکا۔!! میں نے اپنی اس تساہلی پر جو محض ذوالفقار کے مشاہدہ میں ہی گزار چکا تھا خود کو لاکھ صلواتیں سُنائیں۔

نہ دیکھا آنکھ اٹھا کر جلوۂ دوست　　قیامت میں تماشہ بن گیا میں

شاید یہ باب مدینۃ العلم اور مولائے متقیان کی رہبری ہی ہے جس کے تحت میں اس کتاب کو اتنے کم عرصہ میں مکمل کر سکا۔

مجھے خود نہیں معلوم کہ اتنے سارے حقائق مجھ پر کیسے منکشف ہو گئے۔ اتنے سارے حوالے کیسے حاصل ہوئے جدید علم کے انکشافات اور تحقیق کن سے فراہم کیں۔ جو کل اس قدر آسانی سے مل رہے تھے آج جب دوبارہ تلاش کرتا ہوں تو ڈھونڈھنے سے بھی نہیں ملتے۔!!

میں "حیات بعد از موت" کو پیش کرنے میں کس حد تک کامیاب رہا ہوں۔ یہ فیصلہ میں اپنے ذی علم قارئین پر چھوڑتا ہوں۔

خادم
سیّد امتیاز اختر
پرتاب گڑھی

اِبتدائیہ

موت۔ ایک وحشتناک تصور۔ ایک دل سوز خیال۔ ایک المناک لمحہ۔ مگر ایک تلخ حقیقت ہے۔!! اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان کی یہ دنیاوی زندگی خداوند کریم کا ایک بیش بہا عطیہ ہے۔ اور اس کے خاتمہ کا تصور اس کے لئے باعث رنج وغم ہے۔ انسان خواہ اسے خوشی سے قبول کرے یا بہ جبر وکراہ وہ اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ اسے اس دنیا میں آنے کے بعد ایک مدّت معینہ تک زندگی کے دن گزارنا ہیں اور پھر اسے ایک دن اس جہانِ فانی کو چھوڑ کر موت سے ہم آغوش ہو جانا ہے۔ اس کے بعد اس کی دنیاوی زندگی کی کتاب بھی ہمیشہ کے لئے بند ہو جاتی ہے۔ یہ ایک ایسی عالمی حقیقت ہے جس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔

اس عالمِ فانی میں پیدائش اور موت کا چکّر چل رہا ہے۔ یہ ایک ایسا گرداب ہے جس سے باہر نکل پانا نہ تو ممکن ہے اور نہ کوئی راہِ نجات۔ اس دنیاوی زندگی میں نہ تو بقا ہے اور نہ دوام۔ اس کے باوجود یہاں کی ہر چیز ایک مربوط نظام کے تحت چل رہی ہے اور یہ کاروانِ حیات بھی ایسے ہی مخصوص اور واضح راستوں پر چل کر اپنی منزل آخرۃ پر ختم ہو جاتا ہے۔!!

مگر سوال یہ اٹھتا ہے کہ کیا دنیاوی زندگی کا یہ مختصر سا لمحہ جس میں لوگ آتے ہیں اور کچھ دن گزارنے کے بعد دوسرے آنے والوں کے لئے جگہ خالی کر جاتے ہیں۔ بس یہی زندگی کی حقیقت ہے۔ کیا اس دنیاوی زندگی کے بعد۔ اس قلیل مدّت قیام کے بعد کچھ نہیں ہے۔ اتنے عظیم نظامِ قدرت کے تحت پیدا ہونے والے انسان کا اس قدر حقیر سا انجام۔ اس کا فنا

کے گھاٹ اتر جانا اس حیات کے بعد تاریکی۔ ایک ایسا عدم جس پر وجود کا سایہ تک نہیں پڑ سکتا۔!!

حقیقت تو یہ ہے کہ اس زندگی کے بعد ایک دوسری زندگی بھی ہے۔ جو دائمی ہے۔ جاودانی ہے۔ اور جسے فنا نہیں ہے۔ اس عالمِ فانی کے بعد ہی عالمِ جاودانی ہے جہاں یہ اجسامِ انسانی اپنی تشکیلِ نو کے بعد حیاتِ ابدی حاصل کرلیں گے۔ اور اس زندگی کے بعد ایک ایسا جہانِ لافانی ہے جو لامحدود ہے۔ اور وہی ہے مقصدِ حیات۔ وہی ہے دارِ قرار۔ اور وہی ہے دارِ بقا، جہاں انسان اس دارِ فنا کی مدّت گزارنے کے بعد پہنچ جائے گا۔

اگر ہم اس چند روزہ دنیاوی زندگی پر ہی اعتبار کرلیں تو پھر ہم خود کو آلام و مصائب۔ تفکرات اور رنج و غم میں گھرا ہوا پائیں گے اور اس طرح اس دنیا کے سارے عیش و نشاط اور ہنگامہ آرائیاں آنے والے کل کی تاریکیوں میں مدغم ہو جائیں گے یا پھر ہماری دنیاوی زندگی وحشت۔ ظلم۔ الحاد اور استبداد سے پُر ہوکر اور تمام مکروہات سے مغلوب ہوکر خود ایک وبالِ جان بن جائے گی۔ جس کے نتیجے میں ایسے ناپسندیدہ حالات پیدا ہو جائیں گے جن سے کوئی بھی ذی ہوش و عقل انکار نہیں کرسکتا۔ اس کے برخلاف عقل و دانش رکھنے والے مفکّرین اور قوانینِ فطرت سے آگاہ اذہان اس فانی دنیا سے ہٹ کر اسبات کا یقین رکھتے ہیں کہ موت محض اس مادّی دنیا کو چھوڑ کر فطری آزادی حاصل کرلینا ہے۔ اور اس کے بعد ایک ایسی دنیا کی طرف عود کر جانا ہے جو ہر قسم کی مادّی پابندیوں سے آزاد ہے۔ انھیں اسبات کا علم ہے کہ انسان اس قفسِ عنصری اور جسدِ خاکی کو چھوڑ دینے کے بعد ایک "مثالی لباس" پہن کر ایسے جہانِ لافانی کی طرف پرواز کر جائے گا جہاں دوام ہے۔ جہاں بقا ہے اور جہاں ہمیشگی کی زندگی ہے۔

اس عالمِ فانی سے گزر جانے کے بعد ایک دوسری دنیا بھی ہے۔ مرنے کے بعد دوسری دنیا

کے ایسے متعدد اور مثالی واقعات سامنے آئے ہیں جن سے ایک مادّہ پرست اور محض اسی دنیا کو حتمی سمجھنے والا انسان بھی "حیات بعد از موت" سے انکار نہیں کرسکتا۔ اس حقیقت کی وضاحت کے لئے چند مستند اور سچے حوالوں اور واقعات کا پیش کر دینا انتہائی اہم اور ضروری ہوگا۔ یہ ان لوگوں کے سچے واقعات ہیں، جو میڈیکل اور طبّی نقطہ نظر سے مردہ ہو چکے تھے۔ اور پھر دوبارہ زندہ ہو گئے۔ وہ مرنے کے بعد اس وقفہ میں کہاں رہے! انھیں کیا کیا تجربات ہوئے! اور انہوں نے کیا کیا دیکھا! اس سلسلے میں دو عالمی شہرت رکھنے والے ڈاکٹروں۔ ڈاکٹر موڈی اور ڈاکٹر ایلز بیتھ ٹیلر کی تحقیق کے نتائج پیش کئے جاتے ہیں۔ یہ دونوں ایک دوسرے ناآشنا تھے اور الگ الگ جگہوں پر اس اہم موضوع پر تجربے کر رہے تھے۔ مگر جب یہ دونوں ملے تو ان کو یہ معلوم کر کے تعجّب ہوا کہ دونوں ایک ہی نتیجے پر پہنچے ہیں۔ ان دونوں نے ایسے چار سو واقعات کا مطالعہ کیا ہے جس میں انہوں نے اپنے ذاتی نظریات اور عقاید کو شامل نہیں کیا دوبارہ واپس آنے والوں میں مختلف عقاید اور مذاہب کے لوگ تھے۔ ان میں کچھ ایسے تھے جن کا "حیات بعد از موت" پر یقین تھا اور کچھ ایسے بھی تھے جن کا عقیدہ نہ تو خدا پر تھا اور نہ "حیات بعد از موت" پر۔ وہ تو بس اس زندگی کو آخری اور حتمی سمجھتے تھے۔ اس طرح ان میں کٹّر مذہبی بھی تھے اور وہ لوگ بھی تھے جو زندگی بھر مذہب سے لاتعلق رہے۔ ان میں کچھ تو حادثات کا شکار ہو کر مرے تھے اور کچھ مختلف بیماریوں میں۔ ان میں مرد بھی تھے، عورتیں بھی تھیں۔ جوان بھی تھے بوڑھے اور بچے بھی تھے اور ان سب کے بیانات اپنے اپنے استطاعت اور علم کے مطابق تھے۔ "حیات بعد از موت" کے واقعات بیان کرتے وقت مرنے والوں کے ساتھ سب سے بڑی دِقتِ بیان۔ زبان اور الفاظ کی تھی۔ کیونکہ اس جگہ کے واقعات بیان کرتے وقت اس جگہ

کی منظر کشی۔ واقعات اور حالات بیان کرنے سے وہ قاصر نظر آتے تھے۔ وہ مناظر اور وہ مقامات کچھ ایسے تھے جن کی مثال ہماری دنیا کی کسی چیز سے دی ہی نہیں جا سکتی۔ وہ کچھ ایسے نئے اور عجیب و غریب تھے جو نہ ہماری دنیا جیسے تھے اور نہ ہماری لغات میں ان کے لائق یا مناسب الفاظ ہی ہیں۔ دوسرے وہ انھیں اپنا ذاتی معاملہ سمجھ کر کچھ بتلاتے ہوئے جھجک بھی رہے تھے کہ کہیں لوگ ان کا مذاق نہ اڑائیں۔ ان سب کے واقعات میں اگرچہ زبان و بیان میں کچھ اختلاف ضرور ہے مگر ان سب کا تجربہ ایک ہی جیسا ہے جس نے "حیات بعد از موت" کا نظریہ پختہ ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر موڈی نے تمام کیسوں کو جوڑ کر ایک موڈل کیس تیار کیا ہے جس میں ساری اہم باتیں پیش آنے والے واقعات شامل کئے گئے ہیں:۔

ایک آدمی مر رہا ہے۔ جب وہ موت کے شکنجوں میں کس جانے کے بعد اپنی تکلیفوں کے نقطۂ عروج پر پہنچ جاتا ہے تو اس کو سنائی دیتا ہے کہ ڈاکٹروں نے اسے مُردہ قرار دیا ہے۔ پھر وہ کچھ نامعلوم سی آوازیں سُنتا ہے۔ جیسے بہت سی گھنٹیاں ایک ساتھ بج رہی ہیں۔ وہ اپنے مردہ جسم کو دور سے دیکھتا ہے وہ یہ بھی دیکھتا ہے کہ ڈاکٹر اسے دوبارہ زندہ کرنے کی کوششیں کر رہے ہیں۔ اور پھر وہ ایک لمبی تیرہ و تاریک سرنگ سے گزرتا ہوا محسوس کرتا ہے۔ اسی سرنگ سے گزر جانے کے بعد وہ خود کو ایک ایسی دنیا میں پاتا ہے جہاں ہر طرف روشنی پھیلی ہوئی ہے۔ اس وقت وہ خود کو ایک نورانی جسم میں پاتا ہے۔ جس میں ایک نئی طاقت ہوتی ہے۔ نئی قدرت ہوتی ہے اور بڑی وسعت ہوتی ہے۔ اور پھر وہ کچھ ایسے لوگوں کو دیکھتا ہے جو دنیا میں اس سے بہت قریب تھے اور اس سے پہلے مر چکے تھے۔ یہ روحانی اجسام اسکی رہبری کرتے ہیں۔ اور پھر ایک "نورِ جسم" اس کے سامنے آتا

ہے۔ ایک ایسی ہستی جس کو اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ مگر یہ نورانی پیکر اس سے بڑی شفقت کے ساتھ پیش آتا ہے۔ وہ نورانی ہستی اس سے کسی ایسی زبان میں باتیں کرتی ہے جو اس کی سمجھ میں آجاتی ہے۔ باتوں کا یہ سلسلہ نہ تو کسی زبان میں ہوتا ہے اور نہ بولنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اور یہ بس ایک سلسلۂ ترسیل ہے جو دو وجود کے درمیان جاری ہوجاتا ہے۔ جس میں جھوٹ بولنے یا بہانہ تراشنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پھر یہ ہستی اسے اسکی ساری زندگی ولادت سے لے کر موت تک کی فلم دکھلاتی ہے۔ یہ ایک ایسی متحرک فلم جیسی چیز ہوتی ہے جس میں اس کی زندگی کے تمام نیک و بد اعمال لمحہ بھر میں اسکی نگاہوں کے سامنے سے گزر جاتے ہیں۔ اور اس طرح وہ ہستی مرنے والے کو اپنی زندگی کے ماحصل کا اندازہ لگالینے کا موقعہ دیتی ہے جب تک وہ فلم دکھلائی جاتی رہی اُسے ایسا محسوس ہوتا رہا جیسے اس میں دو چیزوں کو انتہائی اہمیت دی جارہی ہے۔ (۱) دوسروں سے محبت کرنا (۲) علم کا حاصل کرنا۔

نورِ مجسّم مرنے والے سے کچھ سوالات بھی کرتا ہے جو کچھ اس طرح کے ہوتے ہیں:۔ (۱) کیا تم مرنے کے لئے تیار ہو! (۲) کیا تم مرنے پر راضی ہو! (۳) مجھے دکھلانے کے لئے تم نے اپنی زندگی میں کیا کیا! (۴) تم نے اپنی زندگی میں کون سا ایسا کام کیا ہے جسے تم کافی سمجھتے ہو! (۵) تم اپنی زندگی کے کون سے کام مجھے دکھلانا چاہتے ہو۔! (۶) کیا یہ زندگی کسی لائق تھی! نورانی ہستی یہ سوالات کسی طرح کا الزام لگانے یا ڈرانے دھمکانے کے انداز میں نہیں کرتی۔ اُس کے پاس چاہے اسکا جواب منفی میں ہی کیوں نہ ہو مگر اس کے باوجود اس نورِ مجسّم کی شفقت اور اپنائیت میں کوئی کمی نہیں آتی۔ نورِ مجسّم کی موجودگی ہر مرنے والے کو کسی طرح بھی گراں نہیں معلوم ہوتی بلکہ اس کی موجودگی اس کے لئے باعثِ اطمینان ہوتی ہے۔ ایک

مرنے والے نے تو یہاں تک کہا کہ میں اس کے پاس سے ہٹنا نہیں چاہتا تھا۔

نورِ مجسّم کا مرنے والے کو اس کی زندگی کی فلم دکھلانے کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ اُسے کسی طرح کی معلومات کی ضرورت ہے بلکہ اس کا مقصد ہوتا ہے کہ مرنے والا خود اپنی زندگی کی قیمت لگائے۔ ہماری یادداشت میں بڑی رکاوٹیں ہیں اور اس میں تسلسل قائم نہیں رہ پاتا۔ کچھ باتیں حوادثِ روزگار میں کھو جاتی ہیں۔ کچھ عمداً بھلا دی جاتی ہیں۔ کچھ لاشعور کی تہوں میں محفوظ ہو گئیں۔ کچھ ابھر کر سامنے آگئیں۔ کہیں یادوں کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ مگر وہاں فلم نے ساری زندگی کی تفصیل ایک ہی جھلک میں پیش کر دی۔ ایک ہی لمحہ میں ساری زندگی کی فلم بندی آنکھوں کے سامنے سے گزر گئی اور کس قدر تیز رفتاری کے ساتھ۔ زندگی کی رنگین اور متحرک تصویر۔!! واپس آنے والے اس بات کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کرتے ہیں کہ اس جگہ ہمدردی سے پیش آنے والے اور علم حاصل کرنے کی خاص اہمیت ہے۔ شیعانِ علیؑ اور دوستدارانِ اہلبیت کے مطابق وہ نورانی ہستی ثاقیِ کوثر۔ قسیم جنّت و نار۔ باب مدینۃ العلم۔ وارثِ رسولؐ حضرت علیؑ ابن ابی طالب کے سوا اور کون ہو سکتی ہے۔!!

اس کے بعد مرنے والے کو ایک لائن یا سرحد کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے جو دنیائے فانی اور علم جاودانی کی حدِ فاصل ہوتی ہے۔ اور پھر مرنے والا اسی سرحد کی طرف بڑھتا ہے۔ لیکن سرحد پر پہنچ کر اُسے محسوس ہوتا ہے کہ وہ اب اس سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اور اسے واپس جانا ہے۔ کیونکہ ابھی اس کی حتمی موت کا وقت نہیں آیا ہے۔ وہ اس مقام سے واپس آنا نہیں چاہتا۔ وہ اس دلکش اور پُر مسرّت سکون کو کھونا نہیں چاہتا۔ لیکن یہ اس کے لئے ممکن نہیں ہو سکتا۔ اور وہ اپنے جسم سے متحد ہو کر دوبارہ زندہ ہو جاتا ہے۔ دنیا میں واپس آنے کے بعد وہ اپنے تجربات دوسروں کو بتلانا چاہتا ہے۔ مگر اسے دشواری پیش آتی ہے کہ وہ انِ مافوق الفطرت

چیزوں کو کس زبان میں بیان کرے کیونکہ ان کے لئے دنیاوی لغت میں الفاظ ہی نہیں ہیں۔ مشاہدات بتلاتے ہیں کہ ان تجربات سے گزرنے کے بعد انھیں اپنی موجودہ زندگی ایک تلخ حقیقت سے زیادہ نہیں لگی اور دوبارہ زندگی مل جانے کے بعد بھی وہ خوش نہیں ہوئے۔ ان میں سے کچھ لوگ تو کئی کئی ہفتہ روتے رہے۔ اس ملکوتی دنیا سے واپس آنے کے بعد کوئی بھی اس دنیا میں رہنا نہیں چاہتا تھا۔ ہر مرنے والے کی زندگی اس تجربہ کے بعد یکسر بدل گئی۔ انہوں نے کبھی اس کی تشہیر کو پسند نہیں کیا اور ان کی زندگی کے باقی اوقات خاموشی میں گزر گئے۔ کچھ کی زندگیاں بڑی پُرلطف بھی ہو گئیں کیونکہ ان دِلوں سے موت کا خوف نکل چکا تھا۔ جب تک انسان کو "حیات بعد از موت" کا یقین نہ ہو جائے اور محض اس جہانِ فانی کا تصور قائم کئے رہے اس کی زندگی نہ تو کبھی مسرور ہو سکے گی اور نہ وہ کبھی اس زندگی سے آسودہ ہو سکے گا ـــــ ہر دن وہ اپنی زندگی کو مائل بہ فنا محسوس کرتا ہوا وقت سے پہلے ہی کوچ کر جائے گا۔ اسے زندگی میں کبھی موت کے بعد جیسی تاریکی ہی نظر آئے گی۔ اور بس۔

اس کے برعکس جب انسان کو خدا۔ فرامینِ خدا۔ کتابِ خدا۔ رسالت اور امامت پر یقین ہونے کے ساتھ ساتھ اس بات کا یقین بھی ہو جاتا ہے کہ ہمارے دنیاوی اعمال نیک و بد غم و آلام، سرور و راحت کا کوئی انجام ضرور ہے۔ ہماری یہ زندگی ابدالآباد کی طرف رواں ہے اور اس دنیا سے سفر کر جانے کے بعد ابد کی وسعتوں کی طرف چلا جاتا ہے۔ ایسے ہی لوگوں کے لئے دنیا میں سکون و قرار ہے۔

حشر و نشر اور جزا و سزا کا عقیدہ ہی ایک ایسی قوت ہے جو ظالم اور جابر انسانوں کو ان کے جرائم سے روک سکتی ہے۔ مظلومین کو صبر و قرار دے سکتی ہے اور مومنین کو دعوتِ عمل دے سکتی ہے۔ انسان جب تک اس دنیا میں رہتا ہے تمناؤں اور خواہشات میں گھرا رہتا ہے۔

لیکن وہ انسان جس کا "حیات بعد از موت" اور حشر و نشر پر یقین ہو جاتا ہے وہ اس دنیا کو حقیر اور فانی سمجھ کر اس سے کنارہ کش ہو جاتا ہے۔ ایسا انسان اپنی خواہشات نفسانی کو زیر کر لیتا ہے اور پھر اس کے دنیاوی اعمال اس کی مرضی کے مطابق اور عین عقل کی رہبری میں ہوتے ہیں اور اس طرح وہ اپنے اعمال پر قابو حاصل کرنے کے بعد اپنے انجام کا خالق بن جاتا ہے اور وہ اپنی علمی اور عقلی صلاحیتوں کے مطابق بلند مدارج حاصل کر لیتا ہے۔

جب انسان پر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ کائنات ایک منظم اور باضابطہ قانون کے تحت چل رہی ہے اور اس نظام کا ایک ایسا باریک بین نگراں ہے جس کا نظم و ضبط ایک حقیر چیونٹی سے لے کر دورِ افق پر پھیلے ہوئے سیاروں اور کہکشاؤں تک حاوی ہے۔ اور جب اُسے یقین ہو جاتا ہے کہ یہ ایک ایسا کائناتی نظام ہے جس کی کوئی انتہا نہیں ہے تو یہ بات اسکے ذہن میں نقش ہو جاتی ہے کہ اسکا کوئی چلانے والا ضرور ہے۔ جو قدیم ہے۔ جو قادر ہے۔ جو قوی ہے۔ اور جس کے زیرِ فرمان یہ کائنات رواں دواں ہے اور جس کے اس خوش اسلوبی سے چلتے رہنے کے پیچھے کسی بزرگ و برتر طاقت کا ہاتھ ہے۔ جو خدا ہے۔ خالق ہے۔ مُربی اور پروردگار ہے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اصل مضمون سے پہلے اُس خدائے وحدہٗ لاشریک کی قدرتِ کاملہ کا ایک مُدلّل اور قابلِ قبول خاکہ پیش کیا جائے جو قارئین کی ایمان بالغیب کی طرف رہنمائی کر سکے۔ اور وہ پختہ اور غیر متزلزل ذہن اور پُر یقین اِدراک کے ساتھ "حیات بعد از موت" پر ایمان لا سکیں۔

خالقِ کائنات

آج انسان نے علم ادب اور سائنس میں ترقی کی جن منزلوں کو چھو لیا ہے وہ اسکی ایک دن یا ایک قلیل مدت کی کاوشوں کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اس نے موجودہ علوم میں بتدریج ترقی کی ہے اور اس کے لئے اسے ایک لمبی مسافت طے کرتے ہوئے صدیوں کا سفر کرنا پڑا ہے۔ اسی طرح مذہب اور عقیدہ کے میدان میں بھی اس نے صدیوں ٹھوکریں کھائی ہیں۔ دیگر دنیاوی علوم کی طرح مذہب اور اعتقادات کا سُراغ بھی تاریخ ماقبل سے ہی ملتا ہے۔ اور انسان نے دوسرے علوم کی طرح روحانی ترقیوں کی منزلیں بھی بتدریج طے کی ہیں۔ جس طرح زبانیں۔ ادبیات۔ فلسفہ اور سائنس کی تحقیق اور دریافت انسان کی بتدریج بدلتی ہوئی ذہنیتوں اور تجربات کے بعد ہی پایۂ عروج اور تکمیل تک پہنچی ہیں اسی طرح تاریخ انسانی کے ابتدائی دور سے لے کر آج تک مذہب اور عقیدوں میں بھی کتنی ہی تبدیلیاں آتی رہی ہیں۔ مذاہب تشکیل ہوتے رہے ہیں۔ مذاہب بگڑتے رہے ہیں۔ مذاہب مٹتے رہے ہیں۔ کبھی شجر و حجر کی شکلوں میں۔ کبھی آفتاب، ماہتاب اور سیارگان کی صورتوں میں کبھی حیوانوں اور انسانوں کی شکلوں میں اور اس طرح خداؤں کی کثرت ہوتی گئی۔ معبودوں کی تعداد بڑھتی گئی۔ اور اس طرح خیالی تصوّراتی۔ اور قیاسی خداؤں کی منزلیں طے کرتا ہوا قافلۂ نظریۂ معبود بھی آخر کار ایک وحدہٗ لاشریک تک پہنچ کر مکمل ہو سکا۔

تاریخ ماقبل کا مشاہدہ کرنے کے بعد یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ علوم مادی اور علوم روحانیات دونوں کی ابتدائی اور ارتقائی منزلیں ایک ہی سطح سے ابھری ہیں اور دونوں کی اس تدریجی

ترقی میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔ غور کرنے پر اس بات کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ علم سائنس اور علم روحانیات میں ایک بڑا کردار عقاید اور مشاہدات کا رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ مشاہدات میں آجانے والا علم قبول کر لینا زیادہ آسان ہے جب کہ عقیدوں اور عقلی دلیلوں سے پیش کیا جانے والا علم یقیناً دشوار ہوتا ہے جس کے قبول کرنے کے لئے ذہنی کاوشوں کے ساتھ ساتھ بلندیٔ فکر اور انتہائے محسوسات کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے اور یہ بڑے اعلا دماغوں اور ذہن رسا رکھنے والوں کا کام ہے جو علم الٰہیات کو حاصل کر سکیں۔

حقیقت میں سائنس اور دیگر علوم بھی انھیں تخیلاتی اور دیومالائی دَور سے گذرے ہیں جن منزلوں سے ہوکر کاروانِ عقیدہ اور مذہب گذرا ہے اور انھیں دیومالائی اور مفروضہ دور سے دونوں نے ابتدا کی اور پھر اپنے تحقیقات اور تجربات کے ذریعہ سے دریافت کی اعلاترین منزلیں حاصل کر لیں۔ اپنی ذہنی کاوشوں تجربات اور مشاہدات کے ذریعہ سے عقل انسانی میں یہ بات بھی پُریقین انداز میں محسوس کرنے کی صلاحیت پیدا ہوئی کہ فطرت اور تخلیق کائنات میں مکمل رابطہ اور اتحاد ہے۔ حقائق کی روشنی میں ذہنِ انسانی نے محسوس کیا کہ اس باضابطہ قانونِ فطرت اور اس مربوط دستور کائنات کا کوئی خالق ضرور ہے جس کے حکم سے یہ عالم موجودات ایک مربوط پابندی کے ساتھ سختی سے کاربند ہے۔ ہر اسباب کا کوئی سبب۔ ہر ایجاد کا کوئی موجد اور ہر تخلیق کا کوئی خالق ضرور ہے۔ اور اس نظریہ کے ساتھ فکر انسانی آگے بڑھی۔

ابتدا میں انسان سوچتا تھا کہ اس کائنات کا موجد انسانی یا حیوانی شکلوں میں ظاہر ہو سکتا ہے اور اسی تصور نے انسان کو مادی حیولوں شکلوں اصنام اور ہمزادوں سے گزر کر روحانیات تک پہنچا دیا۔ اس نے آہستہ آہستہ کچھ اور بھی علمی رفعت اور بلندی

حاصل کی اور اس طرح اس کا عقیدہ وحدانیت تک پہنچ سکا۔

میرے اس نظریہ سے خدانخواستہ یہ نہ سمجھ لیجئے گا کہ دین اور مذہب کے اس تکامل میں پیغمبرانِ خدا کا کوئی کردار نہیں تھا۔ دین وحدت (اسلام) کا پودا تو سب سے پہلے حضرت آدمؑ نے ہی لگایا تھا۔ آپ کے بعد جتنے بھی پیغمبرانِ دین آئے اُس پودے کی پرورش اور آبیاری کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبرانِ دین اور بارہ آئمہ طاہرین نے اسی دین کی تبلیغ کی۔ مگر ان کی تعلیمات زمانہ کے ساتھ ساتھ بڑھتے ہوئے علمی معیار اور وسعت ادراک کے مطابق ہی قابلِ قبول ہو سکیں۔ یہاں تک کے خالقِ کائنات نے دین کی تکمیل اپنے آخری رسول حضرت محمد مصطفٰےؐ کے ہاتھوں کی اور اس کی تکمیل کی سند عطا فرمائی۔ آپ کے بعد تعلیم دین وحدت کے لئے پھر کسی نبی یا رسول کی ضرورت نہیں رہ گئی اور آج بھی خواہ وہ کافر ہو یا آتش پرست۔ بُت پرست ہو یا ستارہ پرست۔ سب کا انجام کار عقیدہ یہی ہے کہ خالق تو بس ایک ہی ہے۔!! اور اس طرح اب محض ان کی رہبری کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے جنھیں آئمہ طاہرین پوری کرتے رہے اور وہ رہبری آج بھی جاری ہے۔

اس طرح یہ ہادیانِ دین ہی تھے جنہوں نے دینِ وحدت کو تکامل کی منزلوں تک پہنچانے میں کلیدی رول ادا کیا مگر انسان کچھ اپنی فطری کمزوریوں۔ کچھ اپنی ضد۔ کچھ بغض و حسد اور کچھ علم کی کم مائیگی اور فقدان کی وجہ سے انتہائی آہستہ روی کے ساتھ منزلِ مقصود حاصل کر سکا۔ حضرت آدمؑ کے بعد حضرت نوحؑ کا نام آتا ہے۔ جن کی ساڑھے نو سال کی تعلیمات کے بعد صرف اسی (۸۰) مومن ہی سفینۂ نوح پر سوار نظر آتے ہیں جب کہ رسول اسلامؑ کی تیئس سال (۲۳) کی تبلیغ کے نتیجہ میں آپ کے دَورِ حیات کے آخری ایام میں چوبیس (۲۴) لاکھ

لوگ دینِ حق قبول کر چکے تھے۔ اس سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ دینِ حق کے فرو
پر علم و ادراک اور بلندئ فکر کا گہرا اثر اور براہ راست تعلق رہا ہے۔ اور یہ دونوں اپنی تکامل
منزلوں کی طرف شانہ بشانہ ہی بڑھتے ہیں اگرچہ اس تکامل دین کے لئے مرضیِ خالق اور تکمال
تبلیغ سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔

یہ ساری ارتقائی منزلیں خواہ وہ علم ادب اور سائنس کی ہوں خواہ دینی ہوں فطرت ان
کے عین مطابق ہیں اور یہی فطرت انسانی اُسے اسکی ذہنی اور عقلی کاوشوں کے بناء پر
حیوانوں سے الگ کرتی ہے۔

اس سلسلے میں کچھ منکّرین کا خیال ہے کہ انسان نے حالات کی سختیوں۔ زمانہ کی
تلخیوں اور دشوار ترین حالات کے سامنے جب خود کو کمزور اور بے بس محسوس کیا تو وہ مذہب
کے پناہ میں آگیا۔ مگر کیا ایک کمزور ذہن کا انسان دین کی وضاحت کر سکتا ہے؟ کیا ایک غیر مستحکم ارادہ
کا انسان کسی قوی اور مضبوط مذہب کی تشکیل کر سکتا ہے۔؟ کیا ایک بزدل انسان کے پردۂ
تخیل پر کسی مستحکم دین کا تصور ابھر سکتا ہے۔؟ اور سب سے اہم سوچنے کی بات تو یہ ہے کہ کیا ظالم۔
جابر اور زبردست انسان ایک لاغر اور کمزور مبلّغ دین کی تقلید کرنا گوارہ کرلیں گے۔ رہبرانِ
دین اپنے معاشرہ کے سب سے عظیم کردار اور مستحکم عزم و استقلال کے حامل تھے اور اسی بلند حوصلہ
اور مضبوط قوت ارادی سے انہوں نے بگڑے ہوئے معاشرہ میں دین اور آئین کی تبلیغ انتہائی
کامیاب حدوں تک کی۔ ایسے انسان کمزور ذہنیت اور ناتوان اہلیت کے ہونے کے بجائے
بڑے اولوالعزم اور مضبوط قوت ارادی کے حامل ہوتے ہیں۔ یہ ایسے بلند ارادوں۔ یقین محکم اور
عمل پیہم والے رہے ہیں جنہوں نے بگڑی ہوئی انسانیت۔ بدکردار معاشرہ اور پس ماندہ سماج
کو کامیابی اور کامرانی کے ساتھ نہ صرف دینِ حق پر لگا دیا بلکہ انھیں ظالم اور جابر طاقتوں اور

حکومتوں کے خلاف مقدس جہاد کے لئے مسلّح بھی کر دیا۔ نہ تو انھیں تلخئ روزگار ہی کبھی ہراساں
کر سکی اور نہ انھیں قتل و غارت گری نے ہی مغلوب ہونے دیا۔

یہ انسانی ذہن کی رموز کائنات سے پردہ اٹھا دینے کی طاقت ہی ہے جو اس کے ایمان
کو مستحکم اور قوتِ ادراک کو حقائق سے روشناس کرتی ہے۔ جو شخص جویائے حق اور متلاشئ
واجبات ہوتا ہے اس سے بہتر تندرست ذہن اور قوی ارادہ کا دوسرا کوئی ہو ہی نہیں
سکتا۔ کمزوری اور بیماری تو انسان کے تخیلات کو خود ہی لاغر اور کمزور بنا دیتی ہے۔ ایسا
انسان جو اپنی ناتوانی اور لاغری میں خود ہی مقیّد ہو وہ بھلا عالمی حقائق کو کیا بے نقاب
کر سکے گا۔!

کچھ محققین اور فلسفی کہتے ہیں کہ مذہب کی کوئی قابلِ قبول بنیاد نہیں ہے اور اس کا انحصار
محض مفروضات پر ہے مگر اس کے باوجود آج تک نہ تو وہ لوگ اس کی کوئی قابلِ قبول دلیل
ہی پیش کر سکے اور نہ خدا سے انکار کا کوئی ثبوت ہی پیش کر سکے جس سے یہ بات ثابت ہو
جاتی ہے کہ ان کے طرزِ فکر اور تلاشِ حق میں یا تو عمل کوتاہی ہے یا پھر ان کی جستجو اور جدوجہد
جہالت کی تاریکیوں میں گم ہو چکی ہے۔ اور اگر دین و مذہب کا انحصار مفروضات ہی ہوں تو
علوم سائنس اور طبِ وغیرہ نے آج جو بلندیاں حاصل کی ہیں اور حقائق سے ہم آغوش ہوئی
ہیں ان کی ابتدا بھی تو قیاس آرائیوں اور مفروضہ دلیلوں سے ہو کر ہی پُر یقین۔ مفید اور کارآمد
منزلوں تک پہنچی ہیں۔

انسان کچھ ایسے شعوری حواس اور مدلّل مفروضات کے ساتھ پیدا ہوا ہے جس کے لئے نہ
تو کسی دلیل کی ضرورت ہے اور نہ کسی طرح کا خارجی ثبوت درکار ہے۔ یہ بات الگ ہے کہ
خارجی ہدایات اور تعلیمات نے ان جبلّی تصورات کو مزید مستحکم کیا ہے۔ یہ فطری احساسات اور

ادراک جاہل اور ذی علم میں یکساں طور پر پائے جاتے ہیں۔ مثلاً کُل نصف یا جزُ سے بڑا ہوتا ہے۔ ایک اور ایک دو ہوتے ہیں۔ یہ ایسے عالمی حقائق ہیں جن کے لئے کسی بیرونی علم کی ضرورت نہیں ہے مگر ان فطری حقائق کو بروئے کار لانے کے لئے اور انھیں صحیح طریقوں سے استعمال کرنے کے لئے علم اور سائنس کی ضرورت ہوتی ہے اب اگر ایک عالم اور دانشوران فطری اور بنیادی اصولوں کو غلط ڈھنگ سے استعمال کرے اور مثبت (+) کی جگہ منفی (-) کا استعمال کرے تو غلطی اس عالم اور سائنس داں کی ہی ہوگی نہ کہ اس کے لئے قوانین فطرت کو موردِ الزام ٹھہرایا جائے۔ کوئی بھی محقق اور معلّم مشکوک اور گمراہ اُس وقت ہوجاتا ہے جب وہ پہلے سے طے شدہ فطری اصولوں اور قوانین کو نظرانداز کر دیتا ہے۔

خدا پر ایمان انسان کے لئے قدرتی اور پیدائشی ہے۔ اور اس کا ادراک اُسے اسی وقت ہوسکتا ہے جب وہ اپنے ذہن اور افکار کو دینی اور دنیاوی تہمّات سے آزاد کرنے اور تعصب کی عینک اتار کر تخلیق کائنات پر غور کرے تو پھر وہ خود کو ان اربوں اور کھربوں گردش کرتے ہوئے سیّاروں میں سے ایک میں پاکر خود کو متحرک محسوس کرنے لگتا ہے اور اس وقت وہ یہ سوچنے پر مجبور ہوجاتا ہے کہ اس کی ابتدا ایک ایسے مرکز سے ہوئی ہے۔ جس کا انتخاب اس نے خود نہیں کیا زندگی کے اس سفر میں نہ تو اس کی مرضی کا کوئی دخل ہے اور نہ اس کے ارادوں کا کوئی شمار ہے۔ وہ اس متحرک کائنات کا محض ایک جزو ہے اور بس۔ اس کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچ جاتا ہے کہ اس نظام کائنات کے اور خود اس کے درمیان کوئی رشتہ ہے۔ کوئی لگاؤ ہے۔ کوئی تعلق ہے اور اس نظام قدرت کے پس پشت کوئی ایسی زبردست قادر اور قوی طاقت کارفرما ہے جس کو وہ خود نہیں دیکھ سکتا۔ ایک ایسی طاقت جو اپنے ارادوں اور اختیارات میں خود مختار ہے۔ ایک ایسی طاقت جو انسان جیسی ذرّۂ ناچیز کو بلا کسی کے مشورہ اور تعاون کے عالمِ وجود میں

لاتی ہے۔ اور پھر ایک دن فنا کے گھاٹ اُتار دیتی ہے۔!!

یہ ایک جویائے حق کا ذہن رسا ہی ہے جو فیصلہ کرنے میں اس کی مدد کرتا ہے کہ کوئی چیز بغیر بنانے والے کے نہیں بن سکتی۔ بغیر فاعل کے کسی فعل کا صدور نہیں ہوسکتا اور بلا عامل کے کسی عمل یا ردعمل کا ہونا ناممکن ہے۔ کیا اپنے آپ پیدا ہوجانے کی کوئی مثال علم انسانی آج تک پیش کرسکا ہے۔ اگر ازل سے آج تک ایک بھی ایسی مثال مل سکتی تو ہمیں کہنے کا حق ہوتا کہ اس امکان پر تخلیق کائنات کے سلسلے میں غور کیا جاسکتا ہے۔ مگر قانون فطرت تو یہی ہے کہ نہ تو کوئی مادّہ ختم ہوسکتا ہے اور نہ کوئی نیا مادّہ پیدا ہوسکتا ہے اسی طرح نہ تو کوئی توانائی ختم ہوسکتی ہے اور نہ کوئی نئی توانائی پیدا ہوسکتی ہے۔ موجودہ دور کی جدید سائنس بھی اسبات کے ثبوت فراہم کرچکی ہے کہ قانونِ فطرت کے تحت کسی مزید شے کے خلق ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے۔

اور اگر کوئی اس کے خلاف نظریات قائم کرتا ہے تو وہ علمِ سائنس اور علمِ فطرت سے لاعلم ہے یا جان بوجھ کر بنیادی حقائق سے چشم پوشی کر رہا ہے۔ اور اس طرح اس کا یہ دعویٰ بے دلیل انسانی نہ ہوکر حیوانی ہوگا۔

اس کے برخلاف جو لوگ اپنی پیدائشی اور فطری عقل و ادراک پر ثابت قدم ہوتے ہیں وہ مقامی حالات۔ رسوم اور فاجرانہ ذہنیتوں اور ماحول سے متاثر ہوئے بغیر اپنی باطن کی آواز دل کو سُنتے ہیں اور اپنے کردار عمل سے حقائق کو آشکار کرتے ہیں۔ ایسے لوگ حق و باطل میں تمیز کرتے ہیں اور پھر جادۂ حق سے بھٹکتے نہیں بلکہ اپنے دلائل کو حق اور آئین کی بنیادوں پر قائم کرنے کے بعد یقین کی شمعیں روشن کرتے ہیں۔ کیونکہ انسان داخلی اور جبلّی شعور کے ساتھ پیدا ہوا ہے۔ یہی جبلّی شعور اور باطنی نور انسان کو دلی راحت اور سکون پہنچاتا ہے۔

جب ایک مادّہ پرست اور اپنی کامیابی اور شہرت کا بھوکا انسان اپنے عروج اور شہرت کے دنوں میں مدہوش ہو کر حقائق کی طرف سے آنکھیں بند کر لیتا ہے تو پھر وہ خدا کی بے پناہ طاقتوں کو نہیں دیکھ سکتا۔ لیکن وہی انسان جب کبھی مصیبتوں شکستوں اور بربادیوں سے دوچار ہوتا ہے تو سیدھے اُسی قادرِ مطلق کے دامن اماں کی طرف بھاگتا ہے جس کا کبھی وہ انکار کیا کرتا تھا۔

بُت پرستی۔ آفتاب و ماہتاب پرستی۔ ستارہ پرستی۔ آفریتوں اور جانوروں کی پرستش توہماتی ہی سہی۔ غیر مہذّب اور گمراہ کن ہی سہی مگر یہ سب اسبات کے گواہ ضرور ہیں کہ انسان کو اپنی جبلّی فطرت کی بناء پر اپنے پیدا کرنے والے کی تلاش ضرور تھی۔ اپنے خالق کا تصور ان کے دلوں میں ابتدا سے لے کر ہر دَور اور ہر زمانہ میں رہا ہے۔ اصنام پرستی کا یہ ابتدائی دَور بھی سائنس اور ٹکنالوجی جیسا ہی ہے۔ ان علوم اور سائنس کی بنیادیں بھی مفروضات اور قیاس آرائیوں پر ہی نظر آتی ہیں جو تحقیق اور دریافت کے سہاروں پر آگے بڑھتی رہیں اپنی منزلوں کی طرف۔ کامیابیوں کی طرف ایک کا قدم تکمیل علم اور حصول سائنس کے لئے دوسرے کا قدم اپنے حقیقی خالق اور وحدہٗ لاشریک کے لئے!!

علوم کی ترقی کے ساتھ ساتھ انسان نے تخلیق کائنات۔ ہستئ کائنات اور بقائے حیات پر غور کیا۔ غور کرتے رہے ہیں اور غور کرتے رہیں گے پھر بھی وہ اپنے حاصل شدہ علم کو صِفر سے زیادہ نہیں پائیں گے۔ رموز کائنات کے بحرِ زخّار سے ہمارے حاصل شدہ علوم اور معاملات کی کوئی نسبت نہیں ہے۔ لاکھوں محققین اور دانشور آئے اور تھک کر چلے گئے مگر آج بھی ایسا لگتا ہے جیسے ہم جس جگہ سے چلے تھے اس سے محض چند قدم ہی آگے بڑھ پائے ہیں۔
آج بھی علماء اور عقلاء جس کو اپنے علم کی معراج سمجھ رہے ہیں وہ کچھ ایسے ہی ہے جیسے تاریکیوں کے عظیم صحرا میں ایک ننھی سی شمع روشن کر لی ہو جس کے آگے۔ پیچھے۔ دائیں اور بائیں

اب بھی نامعلومیت اور مجہولات کے اندھیرے چھائے ہوئے ہیں۔ ایک ایسا اندھیرا جو لاکھوں برس پہلے تھا وہ آج بھی قائم ہے۔ علم کے ساتھ ساتھ لاعلمی کا غبار اور بھی دبیز اور گہرا نظر آنے لگا ہے۔ ایک ایسا غبار جس میں خود انسان کو اپنی خبر نہیں ہے۔ مختصر یہ کہ نہ تو ہم اپنے آغاز سے باخبر ہیں اور نہ انجام سے۔ ہم کو تو یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ محض اپنے اس چھوٹے سے کرّۂ زمین پر کتنی زندگیاں موجود ہیں یا پھر ان کروڑوں اور اربوں اجرام فلکی پر کیا ہے۔ جو ہم کو اپنی طاقتور ترین دوربینوں سے بھی محض ایک پن کی نوک سے زیادہ نظر نہیں آتے۔

اگر ہم لاکھوں صدیوں تک ایک لاکھ کیلومیٹر فی سکنڈ کی رفتار سے بلا کہیں رُکے ہوئے سفر کرتے رہیں پھر بھی ہمیں وہی کائنات نظر آئے گی۔ وہی افلاک نظر آئیں گے۔ وہی ستاروں کا جھرمٹ ہوگا اور اسی طرح کی نئی کہکشائیں ہوں گی۔ نیا عالم ایجاد ہوگا۔ نئی موجودات ہوں گی اور پھر اس کے بعد کیا ہے؟ پھر وہی صورتِ حال۔ یہ افق کہیں سے بند نہیں ہے یہ آسمانی راستے کہیں ہماری صدِ راہ نہیں ہیں۔ ہمیشہ وہی کائنات۔ ہر جگہ وہی خلائیں۔ وہی اجرام فلکی اور ان کا اپنے مدار پر وہی گردشِ عمل۔ اس دائرہ کا نہ تو کہیں مرکز نظر آئے گا اور نہ آخری کنارہ۔ اور انجام کار ہمیں محسوس ہوگا کہ ابھی تو ہم نے اس عالم لامتناہی کا مطالعہ شروع بھی نہیں کیا۔ ابھی تو ہم اپنی کتاب تحقیق کے پہلے صفحہ کو ہی ختم نہیں کر سکے۔! ابھی تو ہم نے کچھ بھی نہیں دیکھا۔ اب خوف کے مارے قدم پیچھے کو ہٹ رہے ہیں۔ یہ اب تک کی اتنی لمبی مسافت بے مقصد ہی رہی۔ مسافر تھک گیا۔ کہاں گرے کچھ معلوم نہیں۔!!

ذہن انسانی نے آج تک لاتعداد تحقیق و دریافت کی۔ لاکھوں کتابیں لکھ ڈالیں جس میں زیادہ سے زیادہ ایک سو یا ایک ہزار سیاہی کی بوتلیں ہی کافی ہوں گی۔ لیکن اگر تمام کائنات

خواہ وہ زمینی ہو یا آسمانی۔ بادی ہو یا خلائی۔ ماضی ہو یا مستقبل۔ اگر ان سب کو تحریر کیا جائے تو ساری دنیا کے سمندر بھی کم پڑیں گے۔

"کہدو اگر سمندر میرے پروردگار کی باتوں کو لکھنے کے لئے سیاہی ہو جائے تو قبل اس کے میرے پروردگار کی باتیں تمام ہوں سمندر تمام ہو جائیں گے۔" (۱۸۔۱۰۸)

جس طرح ہم کسی دانشور کی علمی خدمات کا اندازہ اس کی قیمتی تصنیفات سے لگا سکتے ہیں۔ جس طرح ہم کسی موجد کی اہلیت کا اندازہ اسکی ایجادات سے لگا سکتے ہیں۔ جس طرح ہم کسی فنکار کی صلاحیتوں کا اندازہ اس کے فنی نقوش سے لگا سکتے ہیں اسی طرح ہم خدائے وحدہٗ لاشریک کی قدرت کا اندازہ اس کائنات کے موجودات سے لگا لینا چاہتے ہیں مگر یہ بھی محال ہے۔ یہی ناممکن ہے۔ ہم مکمل طور سے اس کی معرفت حاصل کر ہی نہیں سکتے کیونکہ انسان کی قوت معرفت اس لائق ہی نہیں ہے کہ اس کی ساری تخلیقات اور مخلوقات کا مکمل احاطہ کر لینے پر قادر ہو سکے۔ ہم کتنا ہی اپنے عقل و ادراک کو وسیع سے وسیع تر کر لیں۔ اپنی ساری صلاحیتیں بروئے کار لائیں یہ ہمارے لئے نہ تو کبھی ممکن ہو سکتا ہے اور نہ ہو سکے گا۔ اور نہ اس تک ہماری رسائی ہی ممکن ہے۔

خدا کی معرفت حاصل کر لینے کے لئے نہ تو ہمارے پاس کوئی عدد ہے اور نہ طریقہ۔ اسکے قدرت علم کا ادراک کر لینے اور اندازہ لگا لینے کے لئے نہ تو ہمارے پاس کوئی آلہ ہے اور نہ میزان۔ ایسی صورت میں اس کے صفات کی معرفت حاصل کر لینے کے لئے عقل انسانی آج بھی عاجز ہے اور شاید کل بھی عاجز ہی رہے گی۔ یہ تو صرف توفیق الٰہی ہی ہے جو کبھی کبھی کسی کسی پر ہدایات الٰہیہ اور اشارات الہامیہ بن کر بجلی کی طرح چمک جاتی ہے۔ اور اسی نور السماوات والارض کی چمک سے اس پر معرفت کی راہیں روشن ہو جاتی ہیں۔

یہ دین اسلام ہی ہے جس میں خدا کی معرفت انتہائی واضح اور عقلی بنیادوں پر قائم ہے۔ اور جو کائنات پر غور کرنے کی مدلل انداز سے تعلیم دیتا ہے۔ صحیح اور غلط افکار کو واضح کرتے ہوئے توحید تک پہنچنے کی راہیں روشن کرتا ہے۔

قرآن اعلان کر رہا ہے۔

"کیا ان لوگوں نے خدا کو چھوڑ کر کچھ اور معبود بنا رکھے ہیں (اے رسولؐ) کہو کہ بھلا اپنی دلیل تو پیش کرو۔ جو میرے زمانہ میں ہیں ان کی کتاب (قرآن) اور جو لوگ مجھ سے پہلے تھے ان کی کتاب (توریت اور انجیل) موجود ہیں۔ (ان میں خدا کا شریک بتلا دو) بلکہ ان میں سے اکثر تو حق (بات) کو جانتے ہی نہیں۔ (تو جب خدا کا ذکر آتا ہے) یہ لوگ منہ پھیر لیتے ہیں۔"
(۲۱۔۲۴)

جس شخص کا تعلق توحید سے ختم ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو خود ہی گمراہ کر لیتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک دن وہ خود اپنے آپ کو بھی گم کر دیتا ہے۔ اس کے بعد وہ قانون فطرت سے بھی اپنا رشتہ توڑ لیتا ہے اور آخر کار وہ خود اپنی ذات اور فطرت سے بھی اجنبی ہو جاتا ہے جس کے نتیجے میں وہ دوسری لاحاصل طاقتوں کے سامنے سرنگوں نظر آنے لگتا ہے۔ ایسے گمراہ بندہ کی دلیل بھی انھیں مصنوعی اور عارضی خداؤں کے سامنے اپنا ضمیر ختم کر کے سجدہ ریز ہو جاتی ہے جس کے نتیجے میں اس کے احساس وحدت کو مار کر مادہ پرستی اور بت پرستی زندہ ہو جاتی ہے۔

قرآن حکیم نے وحدانیت کی شناخت کے لئے ربوبیت کی طرف رہنمائی کی ہے۔

کیا یہ لوگ بلا کسی کے (پیدا کئے) بغیر ہی پیدا ہو گئے ہیں یا یہی لوگ (مخلوقات) پیدا کرنے والے ہیں۔ یا انہوں نے ہی سارے آسمان اور زمین پیدا کئے ہیں۔ (نہیں) بلکہ یہ لوگ

یقین نہیں رکھتے۔" (۵۲۔ ۳۵ و ۳۶)۔ ہر اس قابل محسوس چیز پر جسے انسان اپنے گرد و پیش دیکھتا ہے بغور سوچنا چاہئے اور نتیجہ اخذ کرنا چاہئے۔ جس کی قرآن نے بھی تعلیم دی ہے"۔ اور تمہارا معبود تو وہی خدائے یکتا ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں جو بڑا مہربان اور رحم کرنے والا ہے۔"

"بیشک آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور رات اور دن کے الٹ پھیر میں اور کشتیوں (جہازوں) میں جو لوگ نفع کی چیزیں (مال تجارت وغیرہ) دریا میں لے کر چلتے ہیں۔ اور پانی میں جو خدا نے آسمان سے برسایا پھر اس سے زمین مردہ (بنجر) ہونے کے بعد جلایا (شاداب کر دیا) اور اس میں ہر قسم کے جانور پھیلا دیئے اور ہواؤں کے چلنے میں اور ابر میں جو آسمان اور زمین کے درمیان (خدا کے حکم) سے گھرا رہتا ہے۔ (ان سب میں) عقل والوں کے لئے (بڑی بڑی) نشانیاں ہیں۔" (۲۔ ۱۶۳ و ۱۶۴)۔

قرآن حکیم میں اُمم سابقہ کے قصّے اس لئے نہیں سُنائے گئے کہ انھیں محض کہانیاں سمجھ کر نظر انداز کر دیا جائے بلکہ یہ خدا کی معرفت حاصل کرنے کے مخصوص انداز ہیں تاکہ ان سے حقائق آشکار ہو سکیں۔ ایسے لوگوں کے غرور۔ نخوت۔ خود پرستی۔ خوش بختی۔ بد بختی۔ کامرانی اور ناکامی کے حالات پڑھ کر انسان ان سے سبق حاصل کرنے کے بعد خدا کی حقیقی معرفت حاصل کر سکے۔ اور فائدے اٹھا سکے۔ جس کے نتیجے میں انسانی معاشرہ خوش حال اور کامران ہو سکے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

"تم سے پہلے بہتیرے واقعات گزر چکے ہیں۔ تو اروئے زمین پر چل پھر کر تو دیکھو کہ (اپنے اپنے وقت کے پیغمبروں کو) جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا۔" (۳۔ ۱۳۷)

یقیناً خدا تمام کمالات اور صفات کا حامل ہے۔ وہ ہر حُسن و جمال۔ ہر عقل و کمال اور ہر ممکن و محال کا خالق ہے۔ اسی خالق وحدہٗ لاشریک نے زمین و آسمان اور تمام اجرام فلکی کو گرنے سے

روک رکھا ہے۔ اگر خدا ایک لمحہ کے لئے بھی ان چیزوں کی طرف سے آنکھیں بند کر لے تو پھر یہ کائنات معدوم ہو کر رہ جائے اور یہ ہستی غبار ہو کر نیستی میں بدل جائے! اسکے ایک کُن کہہ دینے سے یہ عالم وجود ہے جس کا ادراک کر لینا دشوار ہے۔

خدا کی یکتائی کا مطلب یہ ہے کہ اگر ہم تنہا اُس ایک ذات کا تصور تمام موجودات سے الگ ہٹ کر کریں تو اس کا وجود برقرار اور ثابت ہے۔ اگر ہم اس کے وجود کا تصور تمام موجودات کے ساتھ کریں تو بھی اس کا وجود ثابت اور قائم ہے۔ لیکن اگر ہم تمام موجوداتِ کائنات کا تصور خدا کے بغیر کریں تو پھر اس کائنات کی بقاء ناممکن ہے۔ کیونکہ اگر خدا ہی نہ ہوگا تو یہ موجودات کیونکر رہ سکتی ہیں۔ معلوم ہوا کہ خدا "وجود محض" ہے اور اس کے علاوہ اگر کسی دوسرے کو اس کا جیسا ہی خدا مانا جائے تو اس کے لئے بھی ایک دوسری اور ایسی ہی لامحدود کائنات تسلیم کرنی ہوگی اور ایک دوسرا عالمِ جسمانی قبول کرنا پڑے گا جو نہ تو علم میں آنے والی بات ہے اور نہ کوئی عقل اسے قبول کر سکتی ہے۔ اب یہ بات واضح ہو گئی کہ اللہ کا واحد مان لینا ہی جائز بھی ہے اور قابل قبول بھی۔ اور اس کے ساتھ کسی دوسرے خدا کا مان لینا جہل ہے اور بے معنی۔ اس حقیقت کے ذہن میں واضح ہو جانے کے بعد انسان اس عظیم اور لامحدود کائنات کو دیکھ کر اس کی صحیح معرفت حاصل کر لیتا ہے اور پھر وہ معارف کی ان منزلوں پر پہنچ جاتا ہے جہاں سوائے ذات خدا کے اُسے اور کچھ نظر نہیں آتا۔

ہم اپنے علم اور عقل سے یہ بات واضح طور سے دیکھ رہے ہیں کہ یہ نظامِ عالم ایک نظامِ واحد کے تحت ہی چل رہا ہے۔ نفس انسانی نباتات اور سبزہ زاروں کے لئے کاربن گیس مہیا کرتا ہے اور یہ اشجار اور نباتات نفس انسانی کے لئے اس کے بدلہ میں آکسیجن گیس فراہم کرتے ہیں۔ یہ کتنا عالمانہ ربط ہے۔ اگر ان میں سے ایک بھی نظام بگڑ جائے تو صفحۂ ہستی کا وجود ہی

تمام ہو جائے۔ اسی طرح سورج سے زمین کو جو گرمی حاصل ہو رہی ہے وہ صرف اتنی ہی ہوتی ہے جس سے نظامِ موجودات قائم رہ سکے۔ اسی طرح سورج کے گرد زمین کی یہ سرعت رفتار اور سورج سے زمین کا فاصلہ ایسا رکھا گیا ہے کہ اس پر انسان اور جاندار کی زندگی ممکن رہ سکے۔ اگر اپنے محور پر زمین کی گردش کی رفتار ہزار میل فی گھنٹہ سے گھٹا کر صرف سو میل فی گھنٹہ ہو جائے تو دن اور رات کا طول موجودہ وقت سے دس گنا بڑھ جائے گا جس کے نتیجے میں دن کا درجۂ حرارت اس قدر بڑھ جائے کہ تمام نباتات جل جائیں اور زندگیاں دشوار ہو جائیں اور پھر راتوں کی ٹھنڈک اس قدر بڑھ جائے کہ تمام نباتات منجمد ہو کر رہ جائیں اور زندگیاں تلف ہو جائیں۔ کائنات کی خلقت کچھ اس انداز سے رکھی گئی ہے کہ یہاں کی ہر شے ایک دوسرے سے مربوط اور ایک نظام سلاسل سے منسلک نظر آتی ہے۔ کائنات کا ہر ذرہ ایک نظامِ واحد کے تحت مشغول کار ہے۔ اور یہ حقیر سا انسان بھی اس سلسلۂ حیات کی ایک ادنیٰ مگر انتہائی اہم کڑی ہے۔ اسی وجہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کائنات جو اس قدر مربوط اور عالمانہ ڈھنگ سے چل رہی ہے ایک نظامِ واحد کے تحت ہی چل رہی ہے اور اس طرح اسکا موجد بھی ایک ہی ہونا چاہئے جس کی دلیل قرآنِ حکیم نے اس طرح پیش کی ہے۔

"اے رسول تم ان سے پوچھو تو خدا کے سوائے جن شریکوں کی تم عبادت کرتے ہو۔ کیا تم نے انھیں دیکھا بھی ہے۔ ذرا مجھے بھی دکھلاؤ کہ انھوں نے زمین (کی چیزوں) میں کون سی چیز پیدا کی ہے۔ یا آسمانوں میں ان کا کچھ آدھا ساجھا ہے۔ یا ہم نے خود انھیں کوئی کتاب دی ہے کہ وہ اس کی دلیل رکھتے ہیں۔ (کچھ نہیں) بلکہ یہ ظالم ایک دوسرے سے فریب دہی کا وعدہ کرتے ہیں۔ بے شک خدا ہی زمین اور تمام آسمان کو اپنی جگہ سے ہٹ جانے سے روکے ہوئے ہے۔ اور اگر فرض کرو یہ اپنی جگہ سے ہٹ جائیں تو پھر اس کے سوا کوئی نہیں روک سکتا۔ وہ بے شک بڑا

بخشنے والا ہے۔" (۳۵۔ ۳۹ تا ۴۱)۔

بے شک یہ علم خالق کائنات ہی ہے جو ایک ننھے سے پرندے کو زمین کی عظیم کشش ثقل و قوت جاذبہ پر غالب رکھ کر اتنی آسانی کے ساتھ افق پر پرواز کرنے کی طاقت عطا فرماتا ہے۔

یہ خدا کی قدرت ہی ہے جو اہلِ علم اور دانشوروں کو اس کی عظمت کے سامنے سر جھکانے پر مجبور کرتی ہے خدا اپنی قدرت کی طرف اس ایک چھوٹی سی آیت میں اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے۔

"اس کی شان یہ ہے کہ جس چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اس سے فرما دیتا ہے کہ ہو جا اور وہ ہو جاتی ہے۔" (۳۶۔ ۸۲)۔ خدا جس وقت اور جب چاہے اس نظام کائنات کو ایک پل میں ختم بھی کر سکتا ہے۔ وہ جب چاہے ہر شے سے اپنی دی ہوئی طاقت اور سرشت کو معدوم بھی کر سکتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ عناصر کی تاثیرات کو لمحہ بھر میں ختم بھی کر سکتا ہے چنانچہ قرآن حکیم میں اس کی وضاحت اس طرح کی ہے۔

"آخر وہ لوگ (باہم) کہنے لگے کہ اگر کچھ کر سکتے ہو تو ابراہیم کو آگ میں جلادو اور اپنے خداؤں کی مدد کرو۔ (غرض ان لوگوں نے ابراہیم کو آگ میں ڈال دیا) ہم نے فرمایا اے آگ تو ابراہیم کے لئے سلامتی کے ساتھ ٹھنڈی ہو جا۔ (کہ ان کو کچھ تکلیف نہ پہنچے) اور ان لوگوں نے ابراہیم کے ساتھ چال کرنی چاہی تو ہم نے بھی (ان کی چالوں کو) ناکام کر دیا۔" (۲۱۔ ۶۸، ۶۹)

اس سلسلے میں یہ بات واضح کر دینی بھی ضروری ہے کہ خدا کے ہر چیز پر قادر ہونے کا تعلق صرف ممکن امور سے ہی ہے۔ اور عام حالات میں عقل و ادراک سے محال اور ناممکن باتوں کی اس سے امید رکھنا مہمل سی بات ہوگی۔ اور ایسی باتوں کے لئے خدا کی قدرت کے الفاظ کا استعمال کرنا ہی بے معنی ہوگا۔ خدا کی قدرت لامحدود ہے لیکن ہر شے

کو علم اور عقل کے دائرہ کے اندر رکھنا ہی اس کی حقیقی معرفت ہے کسی شے پر قدرتِ الٰہیہ اسی وقت کارفرماں ہوگی جب اس شے میں بھی اس کی صلاحیت ہو کہ اس کی قدرت کمال کی متحمل ہو سکے۔ اور ظرف بھی ایسا ہو جو اسے قبول کر سکے۔ کیا کوئی ظرف ایسا بھی ہو سکتا ہے جس میں ساری دنیا کے سمندر سما سکیں۔ کیا کوئی ہیرا ایسی بھی ہو سکتی ہے جس میں سورج کی تمام توانائیوں کو سمیٹا جا سکے۔ ایک شخص نے حضرت علیؑ سے سوال کیا کہ کیا خدا اسبات پر قادر ہے کہ ساری دنیا ایک انڈے میں سمو دے مگر نہ دنیا چھوٹی ہو اور نہ انڈا بڑا ہو۔ تو آپ نے فرمایا کہ خدا کی طرف عاجزی کی نسبت دینا صحیح نہیں ہے لیکن تم نے جو پوچھا وہ نہیں ہو سکتا۔ (یعنی ذات الٰہی میں عجز نہیں مگر فعل محال اور امر ناممکن کو خدا کی قدرت سے متعلق کرنا غیر معقول اور بے معنی ہے)

خدا کی ذات کے متعلق کسی حد کا تصور کرنا غلط ہے۔ وہ لامکان ہے۔ کسی مکان میں نہیں سما سکتا۔ کائنات کا کوئی گوشہ اس کے وجود سے خالی نہیں ہے۔ وہ ہر شے سے آگاہ ہے۔ کائنات کی کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو اس کی نگاہوں سے پوشیدہ ہو کھربوں سال پہلے گزرے ہوئے واقعات اور کھربوں سال بعد ہونے والے واقعات اس کے دائرہ علم میں ہیں۔ اس سے کوئی چیز غائب نہیں ہے۔ نہ ماضی نہ مستقبل نہ دور نہ نزدیک۔ نہ پوشیدہ نہ ظاہر۔ "پوشیدہ اور ظاہر کا جاننے والا وہی مہربان اور نہایت رحم والا ہے"۔ (۵۹.۲۲).

خدا کا علم ماضی یا حال سے متعلق نہیں ہے۔ وہ مستقبل کو بھی اسی طرح جانتا ہے جس طرح عقل انسانی حال کو جانتی ہے۔ انسان کا علم ہمیشہ ایک خارجی وجود کا محتاج ہوتا ہے۔ انسانی علم کے لئے ایک موجود کی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر خدا کے یہاں یہ بات نہیں ہے کیونکہ اسکا علم حضوری ہے یعنی اس کے لئے کسی موجود کا ہونا ضروری نہیں ہے۔ ہر شے اس کے سامنے

ایک کھلی ہوئی کتاب ہے۔ ذاتِ خدا غیر از موجودات ہے۔ لیکن وہ موجودات سے باہر نہیں ہے۔ حضرت علیؑ نے فرمایا ہے کہ "ماضی اور مستقبل اس کے سامنے حاضر ہیں۔ وہ تمام چیزوں کو جانتا ہے لیکن کسی وسیلہ اور ذریعہ سے نہیں کہ اگر وہ ختم ہو جائے تو خدا کا علم منفی ہو جائے۔ اس کے اور اس کے معلوم میں کوئی چیز علم از زاید نام کی نہیں ہے۔ صرف اسکی ذات ہے اور بس"۔ قرآن حکیم کا ارشاد ہے۔ "وہ خشکی اور تری میں (اس کو بھی) وہی جانتا ہے۔ اور کوئی پتہ بھی نہیں گرتا۔ مگر وہ اسے ضرور جانتا ہے اور نہ زمین کی تاریکیوں میں کوئی دانہ۔ اور نہ کوئی خشک چیز مگر یہ کہ وہ نورانی کتاب میں موجود ہے۔" (۶-۵۶)

یہ حقیقت واضح ہو جانے کے بعد کہ خدا قیود زمان و مکان سے۔ بہت بلند ہے۔ تمام موجودات۔ ماضی اور مستقبل اس کے سامنے حاضر ہیں یہ واجب ہو جاتا ہے کہ ہم اپنی ذمہ داریوں کا احساس کریں اور ہر ایسی لغزش سے پرہیز کریں جو اس کی ناراضگی کا سبب بنے۔ ہم اس خالقِ مطلق اور وحدہٗ لاشریک کے سامنے سجدہ ریز ہو جائیں جس نے ہمارا ہاتھ پکڑ کر زندگی کے عظیم مراحل سے گزارا ہے۔ اپنی رحمتوں کے سایہ میں بڑی سے بڑی فضیلتوں سے نوازا ہے۔ ہم اس دنیا میں رہ کر اس کے بتائے ہوئے راستوں پر اپنے رسول حضرت محمد مصطفٰےؐ اور ان کے اہلبیت طاہرینؑ کی ہدایات کے مطابق گامزن رہیں اور آخرت کے لئے زادِ راہ فراہم کریں۔ تقوےٰ اور پرہیزگاری خوف رجاء کے درمیان اپنا توازن قائم رکھیں۔ ہم اس پاک پروردگار اس رحیم و کریم قادر مطلق سے اپنے انجام کے بخیر ہونے کی دعائیں کرتے ہیں اور اس کے بتلائے ہوئے طریقۂ زندگی پر عمل پیرا رہیں۔

یہ دنیا دار آزمائش ہے جہاں کامیابی حاصل کر لینے کے بعد ہی انسان بہشت بریں کی دائمی راحتوں اور مسرتوں سے ہم آغوش ہو سکتا ہے۔ اور ناکامی کی صورت میں کبھی ختم نہ ہونے والے عذاب علیم میں گرفتار ہو سکتا ہے۔ یہ زندگی اگرچہ چند روزہ ہے اور یہاں کی ہر چیز مائل بہ فنا ہے مگر یہ مختصر سا وقفہ انتہائی اہم بھی ہے اور نتیجہ خیز بھی۔ بالکل میدان آزمائش یا دار امتحان کی طرح جہاں مدت تو مختصر اور طے شدہ ہوتی ہے مگر نتائج گرانقدر ہوتے ہیں۔ اور جہاں کی کامیابی اور ناکامی انسانی زندگی کے ماحاصل ہیں۔ ہمارے دنیاوی اعمال ہمارے کردار کے آئینہ دار ہیں جن پر ہمارے مستقبل کا انحصار ہے۔ جو کامیابی کی صورت میں روشن اور حوصلہ افزاء اور ناکامی کی صورت میں تاریک اور حرماں نصیب انجام کی طرف لے جاتے ہیں۔ جس کی قرآن حکیم نے بڑی وضاحت کے ساتھ تشریح کی ہے۔

"مگر تم لوگ دنیا کی زندگی کو ہی سب کچھ سمجھتے ہو۔ حالانکہ آخرت میں ہی بقا اور دوام ہے۔ یہی بات پہلے صحیفوں میں درج ہے (یعنی) ابراہیم اور موسیٰ کے صحیفوں میں"۔

(۸۷-۱۶ تا ۱۸)

یہ دنیاوی زندگی تو کھیل تماشہ کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ اور اگر یہ لوگ سمجھیں تو جیسی تو اس میں شک نہیں ہے کہ ابدی زندگی (کی جگہ) تو بس آخرت کا گھر ہے۔ کاش یہ لوگ سمجھتے"۔ (۲۹-۶۴)

حیات بعد از موت اور قانون فطرت

علم انسانی کے ابتدائی دور پر نظر ڈالنے کے بعد یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ وہ ایک فکری اور تدریجی تکاملی دور سے گذرا ہے۔ جس میں اُسے حیات بعد از موت پر یقین رہا ہے۔ اور یہ احساسات اس کے لئے کوئی نئے نہیں ہیں۔ ہاں یہ بات الگ ہے کہ ان کے عقاید پر توہمات کی چھاپ نظر آتی ہے۔ اس سلسلے میں آثار قدیمہ کے مطالعہ اور سیر سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ اس سلسلے میں ان کا یہ نظریہ کامل یقین کی بنیادوں پر قائم تھا۔

گزشتہ دور کے مدفون میں مُردوں کے ساتھ دفن کئے گئے ان کے آلات اور حربے اس دعوے کی واضح دلیل ہیں کہ یقین تھا کہ انھیں موت کی تاریک سرنگوں سے گزر جانے کے بعد مرنے والے کو ایک ایسی زندگی مل جاتی ہے جہاں پر انھیں ان آلات اور ہتھیار کی دوبارہ ضرورت پڑتی ہے۔ ان کے تصورات۔ افکار اور عقاید مہمل اور غیر واضح ہی سہی مگر حیات بعد از موت پر انکا عقیدہ راسخ تھا۔ ان کا خیال تھا کہ انسان جس طرح اس دنیا میں زندگی بسر کرتا ہے اسی طرح مرنے کے بعد دوسری دنیا میں بھی اُسے اسی طرح کی زندگی گزارنی ہوگی۔ اس طرح اس وقت کا انسان بھی اس دنیا سے گزر جانے کے بعد دوسری دنیا کا منظر دیکھ رہا تھا اگرچہ اسلامی عقاید سے بہت دور اور بھٹکا ہوا۔ ۔ !! کانگو کے قبیلوں میں جب ان کا بادشاہ مَر جاتا تھا تو اس کی قبر پر نوجوان لڑکیاں جمع ہو کر اسبات کے لئے لڑتی تھیں کہ ان میں سے کون فاتح ہو کر اپنے

مرحوم بادشاہ سے مل سکتی ہے۔ یہ جھگڑا کبھی کبھی تو قتل و غارت پر انجام پاتا تھا۔ جزائر فیجی کے باشندے اپنے والدین کو چالیس برس کا ہو جانے کے بعد زندہ دفن کر دیا کرتے تھے۔ وہ لوگ اس کام کے لئے چالیس سال کی عمر اس لئے مناسب سمجھتے تھے کہ یہی عمر کا نصف حصہ ہوتا ہے جب انسان اپنے جسمانی۔ ذہنی اور روحانی لحاظ سے مکمل ترین اور توانا ترین ہوتا ہے۔ ان لوگوں کا عقیدہ تھا کہ موت کے بعد جب انھیں دوسری زندگی ملے گی تو وہ خود کو مکمل طور سے توانا ہی پاسکیں گے۔ اسی طرح میکسکو کے باشندے اپنے بادشاہ کے ساتھ ان کے مسخروں کو بھی زندہ دفن کر دیا کرتے تھے تاکہ یہ مسخرے اپنے دلچسپ لطیفوں سے بادشاہ کا دل بہلا کر ان کا غم غلط کرتے رہا کریں۔ قدیم یونانیوں کا عقیدہ تھا کہ انسان مرنے کے بعد فنا نہیں ہو جاتا بلکہ اُسے ایک مخصوص زندگی مل جاتی ہے جہاں پر ان کی ضرورتیں بھی وہی ہوا کرتی ہیں جو اس دنیا میں تھیں۔ ان سارے مشاہدات پر غور کرنے کے بعد یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ ان کے یہ عقاید مبہم اور باطل ہی سہی مگر حیات بعد از موت کا انھیں کامل یقین تھا۔ آج کے دور میں بھی ہر مذہب اور ہر عقیدہ کا ماننے والا حیات بعد از موت کا قائل ضرور ہے خواہ وہ کسی صورت میں ہو۔

آج کے جدید دور میں بھی ہم یہ بات یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اس عالم وجود میں کوئی شے یہاں تک کہ ایک حقیر سا ذرہ بھی مبہم اور بیکار نہیں ہے اور اس پر بھی قانون فطرت جاری ہے کتنے کواکب اور سیّارے پیدا ہوتے ہیں اور فنا ہو جاتے ہیں۔ سورج بھی قانون فطرت کے تحت مادہ سے غذا (ایندھن) حاصل کرتا ہے اور یہی غذائی مادہ انرجی (توانائی) میں تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ اور اس طرح ہر ذرہ ایک پوشیدہ توانائی اور انرجی کا حامل ہے اور اس عظیم قانون فطرت کے تحت ہر شے ایک دوسرے سے مربوط ہے۔

لیکن سوال یہ اٹھتا ہے کہ پھر انسان موجودہ نظام اور قانون فطرت سے الگ کیوں نظر آتا ہے! وہ مظالم بھی کر سکتا ہے۔ سنگدل بھی ہو سکتا ہے اور محسن بھی ہو سکتا ہے۔ اور اس کا جواب آسانی سے دیا جا سکتا ہے کہ خدا نے انسان کو عقل اور ارادوں سے مالا مال کیا ہے۔ انسان کو خدا نے قوت ارادی۔ ذہن رسا۔ عقل و ادراک دے کر اُسے آزاد چھوڑ دیا ہے۔ خواہ وہ نیک عمل کر کے اور خواہ بداعمالیاں کر کے زندگی گزارے۔ اگر خدا چاہتا تو انسان کو بھی ان نعمتوں سے محروم کر کے اس کی خلقت کو مجبور محض بنا سکتا تھا اور پھر ہم بھی اس کی دوسری تخلیقات کی طرح اس عظیم کائنات کی مشین کے ایک پُرزے ہوتے۔ لیکن انسان کے لئے خدا نے یہ پسند نہیں کیا۔ کیونکہ پھر یہ جبر ہوتا۔ اختیار نہ ہوتا۔!!

یہ دنیا آئندہ پیش آنے والے مراحل کے لئے ایک درسگاہ ہے۔ ایک مختصر سی گزرگاہ مگر یہ راستہ ایک عالمی سچائی کی طرف جاتا ہے۔ یہ مدّت قلیل ہے مگر یہ ایک کبھی ختم نہ ہونے والی زندگی کی نشاندھی کرتی ہے۔ یہ ایک مختصر سا فاصلہ ہے مگر انتہائی نتیجہ خیز۔!! جہاں عدل ہے۔ جہاں اعمال کی جزا بھی ہے اور سزا بھی۔ جہاں اس دنیا میں کئے گئے افعال اور اعمال کا حساب دینا ہے۔

اگر زندگی بعد از موت اور عدل بعد از موت مہمل ہوتے تو ہم اپنے لئے اور دوسروں کے لئے اس دنیا میں کئے گئے عمل کا تقاضہ ہی نہ کرتے۔ مگر یہ ایک عالمی حقیقت ہے کہ۔

"ہر موت کا پوشیدہ تقاضہ ہے قیامت"

اگر حیات بعد از موت میں ہمیں عدالت کا یقین نہ ہوتا تو پھر ہم عدل الٰہی کی پُر یقین امیدوں میں نیک کاموں کے لئے اپنی جان کی بازی کیوں لگاتے۔ اچھی عدالت آخروی کا جذبہ ہمارے دلوں میں کیسے ہوتا۔ ! کیا ہم کسی ایسے مبہم اور مشکوک نظریہ کا اس حد تک یقین

کرسکتے ہیں کہ اس کے لئے اپنا سب کچھ اور یہاں تک کہ اپنی جان عزیز کی بازی بھی لگا دیتے ہیں۔ ہمیں عدالت الٰہیہ کا یقین اسی طرح ہے جس طرح ایک پیاسے کے لئے وجودِ آب کی دلیل۔

حیات بعد از موت ایک فطری خواہش ہے۔ جس طرح ہماری دنیاوی خواہشات سعیٔ پیہم سے پوری ہو جاتی ہیں اسی طرح ہماری اُن خواہشات کا پورا ہونا بھی فطری ہے جو اس دنیا میں ممکن نہیں ہیں۔ اور جس کے لئے ایک دوسری دنیا کا مان لینا بھی لازماً اور عقلاً قابل قبول ہے۔

ذہن انسانی میں حیات بعد از موت اور اُخروی زندگی کا یقین نہ تو مہمل ہے اور نہ بے بنیاد۔ انسان موت کی طرف گامزن ہے۔ وہ اس دنیا کو چھوڑتا ہے۔ اسکا وجود باقی رہتا ہے اور اس کے ساتھ ایک خواہش بھی اسکے وجود میں باقی رہتی ہے۔ اس کی حیات ابدی حاصل کر لینے کی خواہش اور یہ خواہش اپنے پایۂ تکمیل تک پہنچ جاتی ہے۔ انسان خود حیات ابدی کی ایک جیتی جاگتی اور سچی مثال ہے۔ حیات ابدی کا یہ فطری شعور خود اسبات کی دلیل ہے۔ خدا جب انسان پر کسی حقیقت کے اظہار کا ارادہ کر لیتا ہے تو اس کا بیج اس کے احساسات میں بہت پہلے ہی داخل کر دیتا ہے جو اس کی زندگی کے ساتھ ساتھ بڑھتا ہے اور ایک دن ایک تناور درخت بن جاتا ہے۔ اور اس طرح انسان کے احساسات میں حیات بعد از موت اور اُخروی زندگی کی یہ آرزو پوری نہ ہو۔ یہ ناممکن ہے۔!

تمام آسمانی مذاہب میں حیات بعد از موت اور ایک ابدی قیام گاہ کا عقیدہ واضح ہے اس حقیقت کو پیغمبران دین بھی اپنے ساتھ لائے۔ یہاں تک کہ ان کی رسالت

کی بنیادیں اسی عقیدہ پر قائم ہیں۔ کوئی نبی بھی ایسا نہیں آیا جس نے اس زندگی کے بعد ایک دوسری اور ابدی قیام گاہ اور ابدی حیات کی تعلیم نہ دی ہو۔ جس میں انسان کو اس کے اس دنیا میں کئے گئے ثواب اور عقاب کے مطابق جزا یا سزا نہ ملے۔

خدا اپنے بندوں پر مہربان ہے۔ اسی لئے وہ اس کی خلقت کی ابتدا میں ہی حیات بعد از موت اور حیات ابدی کا احساس اس کے ضمیر میں داخل کر دیتا ہے۔ اپنی رحمت کی تکمیل کے لئے اس نے انبیاء کرام کو آسمانی کتابوں کے ساتھ اسی لئے بھیجا تاکہ وہ لوگوں کو دنیا میں کامیاب اور کامران زندگی گزارنے کے طریقے بتلائیں۔ انھیں خواہشات نفسانی کے عیوب سے آگاہ کرتے رہیں۔ انھیں گمراہی۔ دنیاوی اور خواہشات نفسانی کی رغبت۔ خود سری ظلم و غضب کے گناہوں سے بچنے کی تعلیم دیں۔ ان کی رہبری کریں۔ تاکہ انسان دنیاوی ہلاکت خیزیوں سے بچ کر آگے بڑھ سکے اور عروج کی بلند ترین منزلوں تک پہنچ سکے۔

حیات بعد از موت اور علمِ جدید

حیات بعد از موت کے متعلق دورِ حاضر کے سائنسداں اور علوم جدید کے محققین اور مفکّرین انتہائی اہم حیرت انگیز اور قابلِ قبول نظریات قائم کر رہے ہیں۔ اور اس میدان میں قابلِ قدر پیش رفت ہو رہی ہے۔ مادّہ اور تخلیق کے سلسلے میں دورِ حاضر کے مفکّروں اور سائنسدانوں نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ انسانی جسم کے از سرِ نو تعمیر ہو جانے کے امکانات قوی ہیں۔ اور وہ سب حیات بعد از موت کے نظریہ سے قابلِ قبول حدوں تک متفق ہو چکے ہیں جو انتہائی حوصلہ افزا ابتدا ہے۔ اور آج کے دور میں یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ علوم جدید کی ترقی کے ساتھ ساتھ حیات بعد از موت کے رموزِ پوشیدہ سے پردہ اٹھتا جا رہا ہے۔

دورِ حاضر سے پہلے کے علماء اور محققین حیات بعد از موت کے موضوع پر نہ تو غور کرتے تھے اور نہ ان کا دائرہ علم ہی اس قدر وسیع تھا جسے وہ بروئے کار لا سکتے۔ اسی لئے نہ تو وہ اس پر غور کرتے تھے اور نہ غور کرنے کے لئے ان کے پاس کوئی پختہ بنیاد ہی تھی۔ اور اسی لئے وہ اس حقیقت کی ایک سرے سے نفی کر دیا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ جو کچھ ہے وہ بس یہی زندگی ہے۔ اور اس کے بعد دوبارہ زندگی ناممکن ہے۔ نہ تو وہ نظریۂ حیات بعد از موت کو کسی طرح کا علمی یا تحقیقی مسئلہ بنانا چاہتے تھے اور نہ اس سلسلے میں کسی کاوش کو علمی بنیاد پر قائم ہی کر سکتے تھے۔

آج جدید سائنس کے تجربات اور جدید علوم کی تحقیقات نے یہ بات ثابت کر دی

ہے کہ اگر کسی مادّہ پر کوئی عمل کیا جائے تو اس کے نتیجہ میں مادّہ اپنی شکل ضرور بدل دے گا مگر اس تبدیل شدہ مادّہ کے عناصر نہ ختم ہوں گے اور نہ معدوم ہوں گے۔ مادّہ کی محض شکلیں ہی بدلتی رہتی ہیں آج ہم جن چیزوں کو دیکھتے ہیں وہ انہیں مادّوں کی بدلی ہوئی شکلیں ہیں اور ان شکلوں میں بھی ایسے خواص ہیں جو آگے چل کر کسی عمل کے تحت دوبارہ دوسری شکلوں میں بدل سکتے ہیں۔ پھر تیسری میں اور اس طرح مادّہ بے شمار شکلیں اختیار کر سکتا ہے مگر اصل مادّہ میں نہ تو کوئی کمی واقع ہو سکتی ہے اور نہ زیادتی۔ اور اس طرح یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وجود کبھی ختم نہیں ہوتا۔ وہ تو صرف شکلیں بدلتا رہتا ہے۔ اور مادّہ کے یہ تغیرات اور تبدیلات اسے کبھی فنا نہیں کر سکتے۔

درختوں سے مرجھا کر گرا ہوا پھل۔ ٹہنیوں سے سوکھ کر گرا ہوا پتا۔ ملوں اور فیکٹریوں سے جل کر نکلا ہوا دھنواں۔ راکھ اور کوئلہ۔ یہاں تک کہ سگریٹ کی تمباکو سے جل کر نکلا ہوا دھنواں کبھی معدوم نہیں ہوتا۔ اور صرف اپنی شکلیں بدلتا رہتا ہے۔ اگر آج ہم ایسے آلات اور ذرائع مہیّا کر سکیں تو ان چیزوں کو دوبارہ ان کی اصلی حالت پر واپس لا سکتے ہیں۔ اسی طرح دنیا جانتی ہے کہ انسانی جسم مٹّی میں دفن ہو کر۔ آگ میں جل کر یا پانی میں ڈوب کر مٹی ہو جاتا ہے۔ یہ سب کچھ اس وجہ سے ہوتا ہے کہ یہ مادّی جسم بھی ہر طرح کے تغیرات اور تبدیلات کا مستوجب ہے اور اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ یہ نہ تو اپنا وجود کھوتا ہے اور نہ کبھی معدوم ہوتا ہے۔ بلکہ دوسری مادی اشیاء کی طرح یہ بھی ان سب سے متاثر ہوتا ہے۔ نہ تو کبھی اس کا وجود ختم ہوتا ہے اور نہ اس کی ذات میں کوئی کمی واقعہ ہو پاتی ہے۔ اور اس کا ابتدائی وجود انسان ہی ہوتا ہے جسے خالق مطلق نے پہلی بار بنایا ہے۔ وہی مادّوں کا مجسمہ۔ وہی وجود پیکر۔ وہی خلیوں اور سیلز

کا مجموعہ۔

یہ حقیقت آج کے دور کی میڈیکل سائنس بھی ثابت کر چکی ہے کہ جو چیز وجود میں آگئی اسکو کبھی فنا نہیں ہے۔ مادّہ نہ تو فنا ہوتا ہے اور نہ کسی نئے مادّہ کا وجود ہوتا ہے۔ عنوان سے الگ نہ ہوگا اگر اس سلسلے میں امام جعفر صادقؑ کے اس علمی نظریہ کو پیش کیا جائے کہ "جو چیز وجود میں آگئی وہ کبھی فنا نہیں ہوتی"۔

اس حقیقت کو ہر ذہن تسلیم کرتا ہے کہ جسم انسانی مٹی سے بنا ہے جو قانونِ فطرت کے تحت اپنے خلئے Cells تبدیل کرتا ہوا ایک دن موت سے ہم آغوش ہو کر ایک بار پھر مٹی ہو جاتا ہے۔ جسدِ انسانی بھی اپنے اندر ان تمام تغیرات اور تبدیلات کی صلاحیت رکھتا ہے۔ مگر نہ تو وہ کبھی اپنا وجود کھوتا ہے اور نہ معدوم ہوتا ہے نہ اسکی ذات میں کسی طرح کی کوئی کمی واقع ہو سکتی ہے۔ یہاں تک کہ مٹی ہو جانے کے بعد بھی وہ نت نئی شکلوں میں عود کرتا رہتا ہے کبھی پھولوں اور پھلوں کی شکلوں میں اگر انسانوں اور جانوروں کا لقمہ بنتا ہے۔ تو کبھی خاک میں مل کر دوبارہ مٹی بن جاتا ہے۔ مگر اس کا وجود کبھی فنا نہیں ہوتا۔ اس کا جوہر (تخم لازوال) ابدی ہوتا ہے۔ جس کا ذکر اس کے محل پر آئے گا۔ اور اس طرح انسان کی ابدیت ہر حال میں مسلّم اور ثابت ہے۔

حد تو یہ ہے کہ ہمارے نیک اعمال کے نتیجے میں اٹھتی ہوئی شعاعی لہریں۔ ہمارے بداعمالیوں سے منتشر ارتعاشی ترنگیں بھی کبھی زائل نہیں ہوتیں اور یہ سب فضائی لہروں میں دائمی شکلوں میں باقی رہتی ہیں۔ اور طریقۂ قدرت اور نظامِ فطرت کے تحت لافانی فضائی ریکارڈ میں محفوظ رہتی ہیں۔ جنہیں وقتِ معینہ پر مالکِ حقیقی کے سامنے ابدی ثواب یا دائمی عذاب کے لافانی ریکارڈ کی طرح پیش کر دیا جائے گا۔

اب جب کہ انسان نے اس سلسلے میں یہاں تک پیش رفت کر لی ہے تو کیا وہ خدا جو خالقِ علم اور عقل و ادراک ہے انسانی اجساد کے منتشر ذرّات اور خلیوں کو دوبارہ وجود میں لا کر ایک بار پھر زندہ نہیں کر سکتا۔ قرآن حکیم کا ارشاد ہے۔

"ہم نے اسی زمین سے تمہیں پیدا کیا۔ اور مرنے کے بعد اسی زمین میں لوٹا کر لائیں گے۔ اور اسی سے دوسری بار (روزِ محشر) تمہیں نکال کھڑا کریں گے۔" (۲۰-۵۵)

اس آیت کے انداز بتلا رہے ہیں کہ موت کے بعد انسان اپنا وجود نہیں کھوتا بلکہ اس کا جوہر لافانی ہے خاک میں مل کر بھی دوبارہ زندہ ہو اٹھنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اس طرح خالقِ مطلق ایک عظیم امر کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ کہ انسان اپنے وجود پر غور کرے۔ علم کی رہبری میں حقیقت شناس ہو۔ اور خدا کی عظیم خلاقی کا احساس کر لے۔ وہ اپنے وجود کو موت کے بعد معدوم ہو جانے پر نہ تو متوحش ہو اور نہ متردّد۔ انسان کا مادّی جسم کبھی فنا نہیں ہوتا۔ اس کی محض شکلیں اور ترتیبات بدلتی رہیں گی۔ دوسرے مادّوں کی طرح اور پھر ایک دن اُس خالقِ مطلق کے قوتِ کاملہ کے تحت یہ سارے متغیر اور منتشر اجزاء اور اعضاء ایک بار پھر اکٹھا ہو کر اپنی ابتدائی انسانی شکل و صورت میں اسی طرح حاضر ہوں گے جس طرح وہ موت سے پہلے تھے۔

ابی بن خلف کا واقعہ تمام تاریخوں اور احادیث میں نقل ہوا ہے جب وہ ایک بوسیدہ اور خاکستر ہو رہی ہڈی کا ایک ٹکڑا لئے ہوئے رسولؐ کے حضور میں آیا اور اسکو ریزہ ریزہ کر کے ہوا میں اڑاتے ہوئے بولا کہ اس سڑی ہوئی اور خاک شدہ ہڈی کو دوبارہ کون زندہ کر سکتا ہے۔ ظاہری حالات بھی کچھ ایسے ہی تھے کہ اس کی بات مدلّل لگ رہی تھی اور اسکا خیال تھا کہ اپنی اس عملی دلیل کے ذریعہ سے وہ نظریۂ حیات بعد از موت کو

ہڈی کے خاک شدہ ذرّات کی طرح ہوا میں اڑا چکا ہے مگر قرآن حکیم نے انتہائی مدلّل ڈھنگ سے اس کا جواب دیا جو ہر ذی عقل اور ذی ہوش دانشور کے لئے قابل قبول ہے۔

"(اے رسولؐ) تم کہہ دو کہ اسکو وہی زندہ کرے گا جس نے ان کو (جب وہ کچھ نہ تھے) پہلی بار پیدا کیا۔ وہ (خدا) ہر طرح کی پیدائش سے واقف ہے جس نے ہمارے واسطے ہرے درخت سے آگ پیدا کر دی۔ پھر تم اس سے اور آگ سلگا لیتے ہو۔ (بھلا) جس (خدا) نے سارے آسمان اور زمین پیدا کئے کیا وہ اس بات پر قادر نہیں ہے کہ ان کو دوبارہ پیدا کر دے۔ (ہاں ضرور قادر ہے)۔ وہ تو پیدا کرنے والا واقف کار ہے۔" (۳۶۔ ۷۹ تا ۸۱)۔ یہ آیات ہر ذی عقل و ہوش کے لئے دعوتِ غور و فکر ہے کہ خدا کی بنائی ہوئی اس عظیم اور عقلوں میں نہ آنے والی کائنات کے پیش نظر انسان کا دوبارہ پیدا کر دینا اس کے لئے زیادہ آسان ہے۔ لازم ہے کہ انسان خدا کی پیدا کی ہوئی اس مخلوق۔ مادّوں کی بتدریج بدلتی ہوئی شکلوں اور ان کی تکوینی منزلوں پر غور کرے تاکہ وہ خود اس حقیقت کو سمجھ سکے۔ انسان کو چاہئے کہ وہ قرآن کی ان حکیمانہ آیات پر غور کرے جو حیات بعد از موت کی طرف راہبری کر رہی ہیں۔

"لوگوں کیا ہم پہلی بار پیدا کرنے سے تھک گئے ہیں (ہرگز نہیں) مگر یہ لوگ از سرِ نو (دوبارہ) پیدا کرنے کی نسبت شک میں ہیں۔ (۵۰۔ ۵۱)۔

خدا کی قدرت کاملہ پر یقین نہ رکھنے والے یہ سوال بھی کر سکتے ہیں کہ مرنے کے بعد انسانی جسم کے اجزا جب خاک ہو کر اِدھر اُدھر منتشر ہو گئے تو کیا دوبارہ اکٹھا ہو کر زندہ ہو سکے گے۔ اس کا ایک مدلّل جواب تو یہی ہو سکتا ہے کہ وہ خالق یکتا اور قادرِ مطلق جو انسان کو اس وقت پیدا کر سکتا ہے جب نہ تو اسکا کوئی وجود تھا اور نہ

کہیں اس کے اجزا تھے تو اس کے لئے ان منتشر اجزا کا دوبارہ اکٹھا کر کے زندہ کر دینا زیادہ آسان ہے۔ وہ اجزا خواہ کتنی ہی دور کیوں نہ پہنچ گئے ہوں۔ مگر ان کا دوبارہ اکٹھا کر دینا اس کے لئے آسان ہے۔ اس کی قدرت لامحدود ہے۔ اس کی خلاقی بے مثال ہے۔ وہ ہر طرح کے پیدا شدہ مخلوق سے خوب واقف ہے اور مرنے کے بعد ان کے منتشر اجزاء سے بھی خوب واقف ہے اور انھیں اپنی پہلی حالت میں واپس لانے پر قدرت رکھتا ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ارشاد فرماتا ہے۔

"کیا انسان خیال کرتا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو بوسیدہ ہونے کے بعد دوبارہ جمع نہ کریں گے (ہاں ضرور کریں گے) ہم اس پر قادر ہیں کہ انکے پور پور درست کر دیں (۷۵۔ ۳تا۴)

اس کائنات پر غور کرنے کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہاں کی ہر چیز رُوبہ حرکت و عمل ہے۔ مادّہ کو نہ تو قرار ہے اور نہ ثبات۔ یہ کاروانِ حیات ہر حال میں رواں دَواں ہے۔ کبھی تو موسم خزاں میں ہر طرف موت کا سا سناٹا چھایا ہوتا ہے۔ درختوں کے پتّے جھڑ جاتے ہیں۔ اشجار مُرجھا جاتے ہیں۔ اور ایسا لگتا ہے جیسے مردہ نباتات کا ایک مقبرہ ہے۔ ہر طرف دور تک پھیلا ہوا مرجھائے ہوئے درختوں کا ایک قبرستان۔ ایک شہرِ خموشاں۔ ہر طرف ایک سناٹا۔ ایک ہو کا عالم۔ پُر ہول ہواؤں کے جھکڑ۔ اور بے شمار چڑیلوں کی چیخ جیسی آوازیں۔ !! سسکیاں لیتی ہوئی شام کی بڑھتی ہوئی تاریکیاں۔ !! مگر پھر موسمِ بہار میں یہی شہرِ خموشاں۔ یہی مردہ اور مرجھائے ہوئے نباتات کا قبرستان ایک بار پھر شاداب ہو جاتا ہے۔ درختوں میں نمو آ جاتی ہے۔ سبزے لہلہانے لگتے ہیں۔ شاخیں اور ڈالیاں پھولوں اور پھلوں سے لَد جاتی ہیں۔ زمین کی قوتِ نمو بیدار ہو جاتی ہے۔ مدّتوں کی سوکھی اور بظاہر مائل بہ فنا بیجوں میں قوت نمو بیدار ہو جاتی ہے۔ سبزے

اُگنے لگتے ہیں اور زمین پر تاحدِ نظر سبزہ ہی سبزہ نظر آنے لگتا ہے اور پھر ایک دن یہی مُردہ زمین۔ یہی شہرِ خموشاں اٹھکھیلیاں کرتا ہوا چمن زار بن جاتا ہے۔ ہر شے میں ایک نئی روح بیدار ہو جاتی ہے۔ اور یہ حیات بعد از موت کی ہی ایک زندہ مثال ہے۔ مگر اہلِ نظر کے لئے۔ اہلِ ہوش و گوش کے لئے اور اُن ذہنوں کے لئے جنہیں قدرت کی صنّاعی کو سمجھنے اور انکا مطالعہ کرنے کی توفیق ہو۔ ایسے باتوفیق لوگ پکار اٹھتے ہیں۔

"برگ درختان سبز در نظرِ ہوشیار۔ ہر ورق اک دفتر ایست معرفت کردگار"

قادرِ مطلق ایسے حق شناسوں کو علم و ادراک سے نوازتا بھی رہتا ہے۔ اور انھیں دیکھ کر اہلِ علم۔ اہلِ ذوق اور اہلِ تحقیق و تجسّس کی رگِ تلاش و جستجو بیدار ہو اٹھتی ہے۔ مگر نافہم اور محتاجِ اذہان نہ تو قدرت کے ان تولیدی اور عالمانہ اشاروں کو سمجھ ہی سکتے ہیں اور نہ نااہل ان سے کچھ حاصل ہی کر پاتے ہیں اور ہمیشہ کی طرح مہمل اعتراضات اور بے بنیاد استدلال دیا کرتے ہیں۔

حق تو یہ ہے کہ اہلِ علم اور تحقیق تجسّس کے دلدادہ اور متلاشی ان ہی سال پیش آنے والے مشاہدات سے حیات بعد از موت کا ایک خاکہ ذہن میں کھینچ سکتے ہیں اور اپنے چاروں طرف بکھرے ہوئے قدرت کے صفحات کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ کل تک یہ درخت اور یہ نباتات خشک تھے۔ یہ زمین مُردہ تھی اور یہ سب اس لئے تھا کہ اس وقت کے اسباب اور حالات ہی ان کے لئے سازگار اور موافق نہیں تھے جنہوں نے ان کی رویدگی اور حرکت و عمل کو روک دیا تھا ان میں آثارِ حیات معدوم ہو چکی تھی۔ اس وقت کا نظامِ قدرت ہی کچھ ایسا تھا جن سے ان کی زندگی کو تلف اور ذوقِ نمو کو معدوم کر رکھا تھا مگر حالات زندگی کے دوبارہ سازگار ہو جانے اور زندگی کے سارے اسباب مہیا

ہو جانے کے بعد ان میں ایک بار پھر زندگی انگڑائیاں لینے لگی۔ ذرا غور فرمائیں حیات بعد از موت کے لئے یہ نباتات کتنے پختہ گواہ اور کتنی مثبت دلیل ہیں۔ اور اگر ان حیاتِ انسانی سے کمتر اور پست حیثیت نباتات میں ممات بعد از موت کے دلائل مخفی ہیں پھر یہ قوانین فطرت انسان کے لئے قابلِ قبول کیوں نہیں ہو سکتے۔ کیا اس کے بعد بھی کسی دلیل کی ضرورت باقی رہتی ہے۔ اس نظریہ کے عالمانہ اور محققانہ دلائل کتاب کے باب "قیامت کا پسِ منظر" میں وضاحت کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں۔ جو دنیاوی اور دینی علوم سے مربوط اور ہم آہنگ ہیں۔

نباتات کا بے حس اور مُردہ بیج جو مدت دراز تک زیرِ زمین ساکت اور بیجان رہ کر بھی اپنی جوہرِ نمو کو زائل نہیں کرتا۔ اور مدّتوں مٹّی میں دبا رہ کر بھی حالات کے سازگار ہو جانے اور مناسب نمی اور اشیائے حیات مہیا ہو جانے کے بعد ایک بار پھر قابلِ نمو ہو جاتا ہے اور زمین کا سینہ چاک کر کے پودا اُگ آتا ہے۔ اسی طرح انسان بھی زمین میں دفن ہو جانے اور مدّت زمانہ کے ساتھ ساتھ مٹّی ہو جانے کے بعد بھی اپنا "تخمِ لازوال" اپنا جوہرِ حیات نہیں کھوتا اور باقی رہ جاتا ہے وہ ایک بار پھر حالات سازگار ہو جانے پر قوانین فطرت کے تحت زندہ انسان کی شکل میں روزِ محشر اٹھ کھڑا ہو گا۔

زندگی ایک رازِ مخفی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عالمی حقیقت ہے۔ زندگی ایک لازوال سچائی ہے۔ یہ ایک ایسا نظریہ ہے جس کی تردید تو کیا ہو پاتی ہاں علم کے فروغ اور اسکے روبہ تکمیل ہونے کے ساتھ ساتھ اسکے حقائق اور بھی واضح ہوتے جا رہے ہیں۔

دورِ حاضر کے محققین اور دانشوروں نے کچھ ایسے جرثوموں کو معلوم کیا ہے جنہیں موجودہ دور کے ایلکٹرانک خورد بینوں سے بھی دیکھا نہیں جا سکتا۔ حالانکہ یہ ایسے طاقتور خورد بین

ہیں جو کسی چیز کو اسکے ایک کروڑ درجہ تک بڑی کر کے دکھلا سکتے ہیں. اس قدر چھوٹے ہونے کے باوجود ان میں زندگی بھی ہے اور حرکت و عمل بھی تو پھر تخم انسانی "تخم لازوال" میں پوشیدہ حیاتی سالمات کو کیونکر دیکھا جا سکتا ہے. اس سے بھی دشوار ہے ان لازوال جرثوموں کا دیکھنا جن کے ذریعہ سے انسان اپنے والدین اور اجداد کے موروثی صفات اور عادات کا حامل ہوتا ہے. قرآن حکیم کا ایک واضح اشارہ حیات بعد از موت پر غور و فکر کرنے اور تحقیق و دریافت کے لئے نئے باب کھول دیتا ہے.

"اور ہم نے آسمان سے برکت والا پانی برسایا تو اس سے باغ (درخت) اُگ آئے اور کھیتی کا اناج لمبی لمبی کھجوریں جن کا خوشہ باہم گٹھا ہوا (یہ سب) بندوں کو روزی دینے کے لئے پیدا کئے. اور پانی سے ہی ہم نے مُردہ شہروں (بنجر زمینوں) کو زندہ کیا. اسی طرح قیامت میں (مردوں کو) نکلنا ہوگا." (۵۰-۹ تا ۱۱).

غور کرنے کی بات ہے کہ جب انسان بہت سے نظر نہ آنے والے جرثوموں اور غیر مرئی مخلوقات کو نہیں دیکھ سکتا تو "تخم لازوال" میں پوشیدہ زندگی کے جوہر کو کیسے دیکھ سکتا ہے. اور زمین کے اندر لاکھوں اور کروڑوں برسوں سے انسانی خاکستر کے اندر چھپی ہوئی تخم لازوال کی حقیقت کا ادراک کیسے کر سکتا ہے جس کے اندر زندگی مچل رہی ہے. تخم لازوال جس میں ایک زندہ خلیہ اسی طرح پوشیدہ ہے جس طرح اپنی خلقت کی ابتدا میں وہ محض ایک خلیہ تھا.

یہ ایک ایسی عالمی حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا. مشہور دانشور اور میڈیکل ڈاکٹر. ایلکس کارل DR. ELEXIE CARLI جنین کے خلیہ کا تذکرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہے کہ انسانی جسم پہلے ایک خلیہ ہوتا ہے. جو دو خلیوں میں تقسیم ہو جاتا ہے.

پھر دو کا چار. چار کا آٹھ. آٹھ کا سولہ. اسی طرح یہ کثرت بڑھتے بڑھتے ایک مکمل انسان کی شکل اختیار کر لیتی ہے. اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ابتدا میں ایک خلیۂ واحد ہی ہوتا ہے جو اپنے اندر تمام اجزاء انسانی محفوظ رکھتا ہے. یہاں تک کہ اسکی آنکھ. ناک. کان. زبان اور یہاں تک کہ اسکے رنگ نسل. قیافہ. اور اطوار تک اس میں پوشیدہ ہوتے ہیں. ساتھ ہی ساتھ یہ بیجان مٹی بھی ان صفات کی حامل ہوتی ہے اور درختوں کی روئیدگی. شاخوں ٹہنیوں. پھولوں. پھلوں کا جزو بنتی رہتی ہے. حضرت علیؑ کا یہ ارشاد بھی اسبات کی واضح دلیل ہے.

"مجھے ان لوگوں پر تعجب ہے جو پہلی پیدائش کو دیکھتے ہوئے آخری پیدائش کا انکار کرتے ہیں." (نہجہ البلاغہ) ساتھ ہی ساتھ ایک عظیم حقیقت سے آگاہ ہونا بھی ضروری ہے کہ انسان کو غذائیت مختلف کھانوں اور مشروب سے ملتی ہے. جس میں گوشت. بناتات. سبزیاں اور پھل سبھی کچھ شامل ہیں. یہ غذائیں انسان کے جسمانی ضروریات کو پورا کرتی ہیں. انھیں غذاؤں اور بناتات وغیرہ سے خون تیار ہوتا ہے. اور نطفہ اسی خون کے جوہر کا نام ہے. اور اس طرح یہ جوہر انسانی درحقیقت مٹی سے ہی عطا ہوتا ہے. اور اس طرح اسکا خلیۂ اوّل مٹی کا ہی خالصہ ہے. جس کا خالق مطلق نے اپنی کتاب حکمت آیات" میں ذکر کیا ہے. اور یہ ایک عظیم علم کی طرف اشارہ ہے.

"اور ہم نے انسان کو مٹی کے جوہر (خالصہ) سے پیدا کیا اور مرنے کے بعد اسی میں لوٹائیں گے اور اسی سے دوبارہ (روز محشر) تمہیں نکال کھڑا کریں گے." (۲۰-۵۵)

ان تمام حقائق پر علم جدید کی روشنی میں غور کرنے کے بعد. یہ بات آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے کہ جس طرح خالق مطلق ایک خلیہ سے جو آنکھوں سے دیکھا بھی نہیں جا سکتا

کروڑوں خلیوں۔ ہڈیوں گوشت اور پوست میں تبدیل کر دیتا ہے یہاں تک کہ اسکے سارے اعضائے رئیسہ بھی محفوظ ہوتے ہیں وہ خداوند علیم وحکیم اسباب پر بھی قادر ہے کہ ان متفرق اجزاء کو اسی ایک خلیے (تخم لازوال) سے دوبارہ پیدا کر دے جو اسکے لئے پہلی اور ابتدائی خلقت سے زیادہ آسان ہے۔

حیات بعد از موت اور عدل الٰہی

دنیاوی عدل پر غور کرنے کے بعد نتائج آسانی کے ساتھ نکالے جاسکتے ہیں کہ اس دنیا میں انسان کو نہ تو اسکے کئے ہوئے نیک اعمال کی خاطر خواہ جزا مل پاتی ہے اور نہ بدکاروں کو ان کی بدکرداریوں کی مناسب سزا ہی مل پاتی ہے۔ یہاں تک کہ مجرم اور ظالم آقا اور حکام جنہوں نے عالمِ انسانیت پر انتہائی مظالم ڈھائے۔ ان کی حرمتوں کو پامال کیا۔ ان کے خون سے اپنے ہاتھ رنگین کئے مگر نہ تو انھیں آخیر تک قانون ہی اپنی گرفت میں لے سکا اور نہ کوئی دنیاوی عدالت ہی انھیں کوئی سزا دے سکی۔ یہاں تک کہ ان پر نہ تو فطرت کا کوئی رد عمل ظاہر ہوا اور نہ کوئی دنیاوی طاقت انھیں موردِ الزام ٹھہرا سکی اور وہ اسی طرح بے ضرر اور بلا کسی تکلیف کے اس دنیا سے کوچ بھی کر گئے اسی طرح مظلوم انسان مظالم کی چکّی میں پستے پستے مر گئے اور آخیر تک نہ تو ان کی فریاد ہی سنی گئی اور نہ فطرت نے ہی انھیں خاطر خواہ سہارا دیا۔ مشاہدہ میں یہ باتیں بھی آئی ہیں کہ اکثر ظلم کے خلاف انقلابات بھی آئے مگر وہ کبھی کامیاب رہے تو کبھی ناکامیاب اور اکثر مجاہدین بدعنوانیوں اور مظالم کا مقابلہ کرتے کرتے موت سے ہم آغوش ہو گئے اور اس طرح اگر ان ظالموں اور مظلوموں کا نامۂ اعمال اسی دنیاوی زندگی اور موت کے ساتھ بند کر دیا جائے اور ان کا عذاب اور ثواب ہمیشہ کے لئے قبروں میں دفن کر دیا جائے تو پھر عدلِ الٰہی اور انصاف رب العالمین کہاں رہا۔ اگر خدائے قادر اور قوی کے یہاں جس کی ایک صفت عادل بھی ہے ان تحریکوں پر عدل نہ ہو

تو اسکے عدل پر آنچ آتی ہے جو اسکے لئے بعید ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ مظلوموں پر جو بھی مظالم ہوتے ہیں یا جنہیں ان کے جائز حقوق سے محروم کیا جاتا ہے اس میں خدا کی براہ راست کوئی شرکت نہیں ہوتی۔ لیکن ظالموں اور غاصبوں کو ان کی دنیاوی زندگی میں یوں آزاد چھوڑ دینا بھی خلافِ عدالت ربانی ہے۔ جس کے لئے حیات بعد از موت لازمی اور ایک تسلیم شدہ امر ہے۔

حیات بعد از موت اس نقطۂ نظر سے بھی اہم ضروری ہے کہ کچھ مجرموں کے جرائم اتنے شدید اور زبردست ہوتے ہیں جس کی سزا ان کی اِس دنیاوی اور محدود زندگی میں ملنا ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ سزا جرم کی مناسبت سے ہی ہونی چاہیئے اور یہی تقاضائے عدل بھی ہے۔ ایک ایسا مجرم جس کا مقصد ہی کمزوروں کو پامال کرنا ہے۔ ناداروں اور بے سہاروں پر اپنے دنیاوی مفاد کے لئے ناجائز دباؤ ڈالنا ہی ہو مجبور انسانوں کا قتل کرنا ہی ہو۔ جن کا مقصد ہی لوٹ مار اور غارت گری کرنا ہو۔ جن پر ہزاروں بے گناہوں کا خون ہو۔ جو اپنی خواہشات نفسانی کی آسودگی کے لئے ہزاروں بے گناہوں کو ذبح کرتا ہو۔ اور ان سب کے بعد بھی وہ اس دنیا کو اپنے لئے بہشت جیسا ہی پاتا ہو یا اگر یہ مان لیا جائے کہ اسے اپنے جرائم کی پاداشت میں پھانسی بھی دے دی جائے تو کیا یہ سزا اسکے ان بے شمار قتل و غارت گری کا بدلہ ہوسکتی ہے۔ جن کا مرتکب وہ ہو چکا ہے! ظاہر ہے کہ اس کے ان تمام مظالم اور دہشت گردی کی سزا محض ایک بار اس کی زندگی چھین لینے سے تو پوری نہیں ہوسکتی اور نہ دنیاوی عدالت میں ایسی کوئی سزا ہو سکتی ہے جو اسکے جرائم کا بدلہ ہوسکے اور اس کی لوٹ مار اور غارت گری کا عملی طور سے مواخذہ کرسکے۔

اسی طرح مظلوموں کو ان کی مسلسل صبر و برداشت کا مکمل اجر و ثواب بھی اس دنیا

میں نہیں دیا جا سکتا۔ اس پر غور کرنے کے بعد یہ حقیقت ہر ذی فہم کی سمجھ میں آجاتی ہے کہ دنیاوی سزا یا جزا چاہے کتنی بھی بڑی کیوں نہ ہو ان کے تمام اعمال کا بدلہ نہیں ہوسکتی۔ اسی طرح جس محقق یا مصنّف نے اپنے علمی اور تحقیقی خزانوں سے بے شمار انسانوں کو فائدہ پہنچایا اُسے اپنی کاوشوں کی اسی دنیا میں جزا نہیں دی جاسکتی یا جس شخص نے اپنی تمام زندگی کارِ خیر۔ عبادتِ الٰہی اور خدمتِ خلق میں گزاری ہو یہاں تک کہ اپنے نیک مقاصد کی تکمیل کے لئے اپنی جان عزیز بھی قربان کر دی ہو تو کیا اس کو اپنی ان تمام قربانیوں کی جزا اس دنیا میں دینا ممکن ہو سکتا ہے۔

یہ عدلِ الٰہی ہی ہے جو ساری کائنات پر حاوی ہے۔ جو ایک ذرّہ ناچیز سے لے کر عظیم اجرام فلکی تک جاری ہے خدا کا یہ نظام اس قدر جامع اور مکمل ہے کہ اگر اس میں کا ایک ذرّہ بھی اپنی جگہ سے ہٹ جائے تو پھر سارا جذب باہمی ہی درہم برہم ہو جائے۔ اور یہ کائنات فنا کی تاریکیوں میں گُم ہو جائے۔ انسان خود بھی اس نظامِ قدرت کی ایک اہم کڑی ہے اس لئے یہ بات سوچنا ہی غلط ہے کہ وجودِ انسانی اس مدبّر کے نظام سے الگ رہے اور ہٹ کر رہے۔ یہ بات الگ ہے کہ انسان کو خدا نے عقل سلیم اور بیدار ضمیر دے کر آزاد چھوڑ دیا ہے۔ مگر اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ وہ دین اور آئین سے مستثنیٰ کر دیا گیا ہے۔ اس کو بھی ایک دن عدالتِ الٰہیہ کے سامنے حاضر ہونا ہے۔ جو اس حقیقت کا منکر ہے وہ نظام کائنات کے اصولوں سے بے خبر ہے۔

یہ بات طے شدہ ہے کہ تمام گنہگاروں اور مجرموں کو ان کے بداعمالیوں کی سزا اسی دنیا میں دینا ممکن نہیں ہے۔ ہاں بعض حالات میں کچھ مجرموں کو اس دنیا میں کچھ سزائیں ضرور مل جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی بداعمالیوں کا بدنما داغ بھی بن جاتی ہیں۔ وہ

انجام کی تلخیوں کا بھی کچھ مزہ چکھ لیتے ہیں اور اس دنیا میں مبتلائے عذابِ الٰہی ہو کر موت کے شکنجوں میں پھنس جاتے ہیں جیسا کہ قرآن میں آیا ہے۔

"خدا نے انھیں رسوائی کی لذت دنیا میں ہی چکھا دی اور آخرت کا عذاب اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔ کاش یہ لوگ اسباب کو جانتے۔" (۳۹۔ ۲۶)

جرائم کی سزا ایک دنیاوی ضرورت ہے۔ جو ہر صورت میں ملتی ہے۔ دُھنواں کا ظہور کسی آگ کا نتیجہ ہی ہوا کرتا ہے۔ کسی کسی گناہ کا عذاب مدّتوں بعد ظاہر ہوتا ہے مگر ہوتا ضرور ہے۔ کیونکہ وہ گناہ کا لازمہ ہے۔ جرم اور سزا ایک ہی درخت کی دو ٹہنیاں ہیں اور سزا ایک ایسا پھل ہے جو ان میں دفعتاً پھوٹ آتا ہے۔ قرآن حکیم کا ارشاد ہے۔

"ہر شخص اپنے اعمال کے بدلہ رہن ہے۔" (۷۴۔ ۳۸)

بُرائیوں کا ردِ عمل اسباب کا شاہد بھی ہے اور گواہ بھی کہ خداوند عادل ظلم اور فساد کو ہرگز پسند نہیں کرتا۔ اور نہ وہ اس پر کبھی راضی ہو سکتا ہے۔ اور ہر فسادی کو عالمِ آخرت میں انصافِ خداوندی کے مطابق سزا ملنی ضروری ہے۔

عدلِ الٰہی اور جبر

بات عدلِ الٰہی آ گئی ہے تو لگے ہاتھوں نظریہ عدلِ الٰہی اور جبر پر بھی ایک اجمالی نظر ڈالی جائے۔ مسلمانوں کے ایک بڑے طبقہ میں یہ عقیدہ رائج ہے کہ انسان اپنے اعمال اور افعال میں مجبورِ محض ہے۔ ان کا نظریہ ہے کہ انسان کے پاس ارادہ بھی ہے۔ عقل بھی ہے اور قدرت بھی ہے مگر اس کے افعال پر ان سب کا کوئی اثر نہیں ہے اور وہ کاموں کے انجام دینے کا ایک آلہ ہے جسے قدرت اپنی مرضی کے مطابق استعمال کرتی رہتی ہے۔ اس سلسلے میں انکی ایک دلیل یہ بھی ہوتی ہے کہ اگر ہم انسان کو اپنے اعمال اور افعال کا مالک اور مختار مان لیں اور اُسے اپنے اچھے اور بُرے کاموں کے لئے واحد مختار مان لیں تو اس نظریہ کے تحت ہم خدا کے دائرۂ قدرت کو محدود کئے دے رہے ہیں۔ جب کہ قرآن حکیم مندرجہ ذیل آیات میں اس کی تردید کر رہا ہے۔

"اور کہہ دو کہ حق تمہارے پروردگار کی طرف سے آ چکا ہے۔ اب جس کا جی چاہے ایمان لے آئے اور جس کا جی چاہے کافر ہو جائے۔" (۱۸۔ ۲۹)

"دین میں کسی طرح کا جبر نہیں ہے۔ ہدایت گمراہی سے الگ واضح ہو چکی ہے۔" (۲۔ ۲۵۶)

"جس نے ذرّہ برابر بھی نیکی کی ہے وہ اسے پائیگا۔ اور جس نے ذرّہ برابر بھی بُرائی کی ہے وہ اسے دیکھے گا" (۹۹۔ ۸)۔ اِن آیاتِ قرآن کے پیشِ نظر بھلا کون مومن اور مسلمان صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی مندرجہ ذیل احادیث کو قبول کر سکتا ہے جس میں مروی ہے کہ خدا بندوں کے اعمال اور افعال اسکی پیدائش کے قبل ہی مرقوم کر دیتا ہے۔

"روایت ہے کہ آدمؑ اور موسیٰ میں حجت ہوگئی تو موسیٰ نے فرمایا کہ اے آدم آپ ہمارے باپ ہیں لیکن آپ نے ہمیں مصیبت میں گرفتار کیا اور جنت سے نکلوا دیا۔ جناب آدم نے جواب میں فرمایا۔ اے موسیٰ خدا نے تمہیں اپنے کلام کے لئے منتخب کیا اور اپنے ہاتھ سے تمہارے لئے لکھا۔ کیا تم اس بات پر مجھے ملامت کرتے ہو جو خدا نے میرے لئے میری خلقت سے چالیس سال قبل ہی مقدر کر دی تھی۔" (صحیح بخاری جلد ۷ صـ۲۱۴۔ صحیح مسلم جلد ۸ صـ۴۹)

اسی طرح صحیح مسلم اور صحیح بخاری میں روایت ہے "تم میں سے ہر ایک کی خلقت اس طرح ہوتی ہے کہ نطفہ اپنے ماں کے بطن میں چالیس روز رہتا ہے۔ پھر علقہ (گوشت کا لوتھڑا) بن جاتا ہے۔ پھر اس حالت میں چالیس روز رہتا ہے اور اس کے بعد مضغہ (گوشت کا ایک ٹکڑا) بن جاتا ہے۔ اور چالیس روز اسی حالت میں رہتا ہے۔ پھر ایک فرشتے کو بھیجا جاتا ہے وہ اس میں روح پھونکتا ہے اور اسے چار چیزوں کا حکم دیا جاتا ہے کہ اسکا وزن۔ موت۔ اور عمل اور اس کی شقاوت اور سعادت کو لکھ دیا جائے۔ قسم ہے اُس ذات کی جس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے تم میں سے جو بھی جنت کے لئے عمل انجام دے گا۔ یہاں تک کہ اس کے اور جنت کے درمیان ایک گز کا فاصلہ رہ جائے گا تو وہ تقدیر کا نوشتہ آگے بڑھ کر اس کی راہ روک لے گا اور وہ ایسے کام انجام دے گا جو جہنم میں لے جاتے ہیں۔ اور تم میں جو بھی بُرے کام انجام دے گا یہاں تک کہ اس کے اور جہنم کے درمیان ایک گز کا فاصلہ رہ جائے گا تو وہ (تقدیر) نوشتہ آگے بڑھے گا اور انسان اچھے کام انجام دینے لگے گا اور وہ اُسے جنت میں لے جائے گا۔" (صحیح مسلم

جلد ۸ صـ۴۴۔ صحیح بخاری جلد ۷ صـ۲۱۰)

اسی طرح مسلم نے اپنی صحیح میں اُم المومنین جناب عائشہ سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا کہ "رسولؐ کے انصار میں سے کسی بچہ کی موت ہوگئی اور میت پر بلایا گیا ہے۔ تو میں نے کہا کہ "خوشا نصیب اسکا کہ وہ جنت کا پرندہ ہے۔ (کیونکہ اس نے کوئی بُرا کام انجام نہیں دیا اور نہ اس سے واقف تھا) آپ نے فرمایا "اے عائشہ اس کے علاوہ بہت کچھ جنت کے اہل پیدا کئے ہیں اور جہنم کے بھی پیدا کئے ہیں اور جہنم کو انکے لئے پیدا کیا ہے۔ درانحالیکہ وہ اپنے آبا و اجداد کے صلبوں میں تھے۔" (صحیح مسلم جلد ۸ صـ۵۵) اسی طرح بخاری نے اپنی صحیح میں روایت کی ہے کہ ایک شخص نے دریافت کیا "یا رسولؐ اللہ کیا اہلِ بہشت اہل جہنم سے پہچانے جاتے ہیں"۔ فرمایا "ہاں" تو اس نے کہا کہ "پس ہم لوگ عمل کیوں انجام دیتے ہیں"۔ آپ نے فرمایا "جو عمل انجام دیا جاتا ہے وہ اسی کے لئے خلق کیا گیا ہے۔ یا اس کے انجام دینے پر مجبور ہے"۔ (صحیح بخاری جلد ۷ صـ۲۱۰)۔ اس قسم کی مفروضہ اور وضع کی گئی حدیثوں کو پڑھ کر مومن کا دل لرز جاتا ہے۔ یا اللہ تو پاک ہے ہر ظلم اور جبر سے۔ تو بلند ہے ہر عیب سے۔ کیا کوئی سچا مسلمان تیری آیات حکیمانہ اور ہدایات عالمانہ سے گریز کر کے ایسی بے بنیاد اور مہمل احادیث کو قبول کر سکتا ہے۔ کیا کوئی مومن قرآن حکیم کی ان ہدایات کا منکر ہو سکتا ہے جن میں تو نے فرمایا ہے کہ۔!

"اللہ انسانوں پر ذرہ برابر ظلم نہیں کرتا لیکن وہ خود اپنے نفسوں پر ظلم کیا کرتے ہیں" (۳۔ ۱۱۷)۔

"خدا کسی پر ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کرتا"۔ (۱۸۔ ۴۹)۔ "اور ہم نے ان پر کوئی ظلم نہیں

[illegible]

[illegible]

واضح رہے کہ یہ ساری لغویات اور گمراہ کن روایات بنی امیہ۔ بنی مروان اور بنی عباس کے بادشاہوں نے اپنے عیوب پر پردہ ڈالنے کی غرض سے وضع کرائی ہیں۔ جو ان کے مظالم اور جابرانہ افعال کے لئے زرہیں ثابت ہوسکیں اور وہ اپنے ان مقاصد میں بڑی حد تک کامیاب بھی ہوگئے۔ یہ حدیثیں آیات قرآنی کے سر سر اخلاف ہیں۔ رسولؐ نے تو فرمایا ہے کہ "جب تمہارے پاس ہماری کوئی حدیث پہنچے اور مشکوک معلوم ہو تو اسے کتابِ خدا سے ملاؤ۔ اگر موافق پاؤ تو قبول کرو اور اگر خلاف پاؤ تو دیوار پر مار دو"۔ مسلم اور بخاری کی اس قسم کی احادیث کتاب خدا اور سنتِ رسولؐ کے منافی ہیں اور ان پر کوئی توجہ نہیں دینی چاہیئے۔ کیونکہ مسلم اور بخاری نہ تو معصوم ہیں اور نہ خارج از خطا۔ خداوندکریم نے ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر بھیجے تاکہ مفسد اور گمراہ کن بندوں کی اصلاح کریں۔ رہبری کرکے انھیں صراطِ مستقیم کی طرف لے آئیں۔ مومنین اور صالحین کو بہشت کی خوشخبری دیں اور مفسدین کو نارِ جہنم سے ڈرائیں۔ خدا اپنے بندوں پر مہربان ہے وہ عادل ہے وہ تو انھیں لوگوں پر عذاب نازل کرتا ہے جن کے پاس انبیاء اور رسولؐ کو رہبری کے لئے بھیجنے پر بھی وہ اپنی گمراہی اور شقاوت پر اَڑے رہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔
"جو شخص بھی ہدایت حاصل کرتا ہے وہ اپنے فائدے کے لئے کرتا ہے اور جو گمراہی اختیار کرتا ہے وہ اپنا ہی نقصان کرتا ہے۔ اور کوئی کسی کا بوجھ اٹھانے والا نہیں ہے۔ اور ہم تو اس وقت تک عذاب کرنے والے نہیں ہیں جب تک کوئی رسولؐ نہ بھیج دیں"۔

(۱۷-۱۵)

لیجئے اب اس سلسلے میں باب مدینۃ العلوم حضرت علیؑ کی ایک واضح اور مدلّل

ہدایت بھی سن لیجئے جسے آپ نے اپنے ایک صحابی کے اس سوال پر فرمایا۔ "کیا ہمارا شام جانا اللہ کی قضا و قدر کے مطابق ہے"۔!

"خدا تم پر رحم کرے شاید تم نے حتمی قضا و قدر سمجھ لیا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر نہ ثواب کا سوال پیدا ہوتا نہ عذاب کا نہ وعدے کے کچھ معنی ہوتے نہ وعید کے۔ خدا نے بندوں کو مختار بنا کر معمور کیا ہے۔ اس نے آسان تکلیف دی ہے۔ دشواریوں سے بچایا ہے قلیل اعمال کا زیادہ اجر عطا کرتا ہے۔ اس کی نافرمانی اس لئے نہیں ہوتی کہ وہ مغلوب ہوگیا ہے اور نہ اس کی اطاعت اس لئے کی جاتی ہے کہ اس نے مجبور کر رکھا ہے۔ اس نے انبیاء کو بطور تفریح نہیں بھیجا اور نہ بندوں کے لئے کتابیں بے فائدہ نازل کی ہیں۔ یہ تو ان لوگوں کا خیال ہے جنہوں نے کفر اختیار کر رکھا ہے۔ افسوس ہے ان لوگوں پر جنہوں نے کفر اختیار کرکے جہنم کمائی"۔ (نہج البلاغہ)

[illegible]

کرکے انہیں صراطِ مستقیم کی طرف لے آئیں۔ مومنین اور صالحین کو بہشت کی خوشخبری
دیں اور مفسدین کو نارِ جہنم سے ڈرائیں۔ خدا اپنے بندوں پر مہربان ہے وہ عادل
ہے وہ انہیں لوگوں پر عذاب نازل کرتا ہے جن کے پاس انبیاء اور رسول کو رہبری
کے لئے بھیجے پر بھی وہ [illegible] گمراہی اور شقاوت پر اڑے رہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے
"جو شخص بھی ہدایت حاصل کرتا ہے وہ اپنے فائدے کے لئے کرتا ہے اور جو گمراہی اختیار
کرتا ہے وہ اپنا ہی نقصان کرتا ہے۔ اور کوئی کسی کا بوجھ اٹھانے والا نہیں ہے۔ اور
ہم تو اس وقت تک عذاب کرنے والے نہیں ہیں جب تک کوئی رسول نہ بھیج دیں۔"

(۱۷-۱۵)

[illegible] اس سلسلے میں باب مدینۃ العلم حضرت علیؑ کا ایک واضح اور مدلل

[illegible]

اس تخلیق کے بارے میں خالق مطلق نے [illegible]

[illegible]

ایک سنسان اور ویران سی آبادی سے ہوتا ہے تو آپ دیکھتے ہیں کہ وہاں کے لوگ

اس کے اعمال اور افعال کے لئے نہ تو کوئی رکاوٹ ہوتی ہے اور نہ بندش۔ اس طرح اس کا یہ مثالی جسم اپنے پہلے والے مادی جسم سے ہر طرح سے اعلیٰ اور افضل ہوتا ہے۔ اس میں سرگرم عمل رہنے کی تمام طاقتیں ہوتی ہیں۔ اس کے افعال کے درمیان کوئی شے نہ تو حائل ہو سکتی ہے اور نہ کوئی رکاوٹ اس کے سامنے آسکتی ہے۔ یہ مثالی جسم ہر قسم کے قید و بند سے آزاد ہوتا ہے اور اسی طرح آزاد رہ کر وہ ابدالآباد تک باقی رہتا ہے۔

حیات بعداز موت پر چوتھا نظریہ رکھنے والے دانشوروں اور محققوں کے مطابق انسان اپنے اسی مادی جسم اور روح کے ساتھ دوبارہ (روز محشر) واپس آئے گا۔ کیونکہ یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ مادہ کو کبھی فنا نہیں ہے۔ نہ تو اس میں کوئی چیز کم ہو سکتی ہے اور نہ بڑھ سکتی ہے۔ اور محض اپنی شکلیں اور اثرات بیرونی تغیرات کے تحت بدلا کرتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اس میں یہ طاقت بھی ہوتی ہے کہ روح کے ساتھ دوبارہ اپنی عملی زندگی بسر کر سکے۔ ان کے مطابق وہ ایک ایسی زندگی ہوگی جو موجودہ زندگی سے بہتر اور افضل ہوگی۔ ان منزلوں پر پہنچ کر جسم اور روح میں ایسی ہم آہنگی ہوگی کہ پھر ان میں دوئی باقی نہ رہے گی بلکہ وہ ہوگی ایک واحد زندگی۔!!

جس کے نتیجے میں اس کی ماہیت۔ حقیقت اور صلاحیت موجودہ زندگی سے انتہائی بلند اور بزرگ ہوگی۔ اور اس طرح ان کی دوسری زندگی موجودہ زندگی کی طرح دو حقیقتوں کا مجموعہ تو ہوگی مگر دونوں میں یکسانیت اور مکمل ہم آہنگی درجۂ کمال پر ہوگی۔

درحقیقت ہم ابھی تک حیات بعداز موت کی کوئی واضح دلیل نہیں پیش کر سکے ہیں جو سائنس یا کسی دوسرے علم کے نقطۂ نظر سے قابل قبول ہو سکے مگر اس سلسلے میں چوتھے نظریہ کی دین اسلام بھی حمایت کر رہا ہے اور جس کی قرآن حکیم نے متعدد جگہوں پر تائید کی ہے۔ وہ قرآن حکیم جس میں انسانی زندگی کے تمام مسائل کا حل موجود ہے۔ اور جس میں انسان کے دوبارہ مجسّم واپس آنے کا ذکر ہے۔ قرآن کتاب خدا ہے۔ اور اپنی تخلیق کے بارے میں خالق مطلق سے بہتر اور کون جان سکتا ہے۔ قرآن حکیم کا نہایت واضح اور بلیغ اعلان ہے کہ انسان اپنے مادی جسم کے ساتھ محشور ہوگا۔

"خدا نے ہی مخلوق کو پہلی بار پیدا کیا۔ پھر وہی دوبارہ (پیدا) کرے گا۔ پھر تم سب اسی کی طرف لوٹ کر جاؤ گے۔" (۳۰۔۱۱)

ایک دوسری جگہ قرآن جسمانی معاد کو اور بھی واضح کر رہا ہے۔

"اور قیامت آنے والی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ جو لوگ قبروں میں ہیں انھیں دوبارہ زندہ ہو کر اٹھنا ہوگا۔" (۲۲۔۷)

قرآن حکیم نے حضرت عزیزؑ کا واقعہ تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہوئے انسان کی اپنے اسی مادی جسم کے ساتھ دوبارہ زندہ ہو اٹھنے کی مثال بھی پیش کر دی ہے۔ جسے انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ کس طرح انسان ہڈیوں کا ڈھانچہ اور خاکستر ہو جانے کے بعد اپنے اصلی جسم میں دوبارہ زندہ ہو کر اٹھ سکتا ہے۔

حضرت عزیزؑ کا قصّہ کچھ اس طرح سے ہے کہ ایک دن آپ اپنی سواری پر جا رہے تھے۔ آپ کے ساتھ اپنے کھانے پینے کا سامان بھی تھا۔ اسی اثناء میں آپ کا گزر جب ایک سنسان اور ویران سی آبادی سے ہوتا ہے تو آپ دیکھتے ہیں کہ وہاں کے لوگ

کچھ اعتراضات اور ازالے

(۱) حیات بعد از موت کے سلسلے میں بعض محققین کی طرف سے یہ سوال اٹھایا جاتا ہے کہ وجودِ آدم سے قیامت تک نہ جانے کتنے لوگ پیدا ہوتے اور مرتے رہیں گے اور روزِ حشر اگر ان سب کو دوبارہ زندہ کیا جائے گا تو کیا اتنے بڑے مجمع اور اس جمِ غفیر کے لئے یہ دنیا کافی ہو سکے گی! مگر یہ اعتراض خداوند عالم کے نظام اور ارشادات کے سامنے مہمل ہو جاتے ہیں جس میں قیامت کی منظر کشی کرتے ہوئے اعلان ہو رہا ہے کہ روزِ قیامت اس سورج کے زیر اثر ساری نظامِ شمسی پر قیامت واقع ہو جائے گی۔ اور سورج کے گرد گردش کرتے ہوئے تمام سیارے اپنی کششِ ثقل کھو کر ایک دوسرے سے ٹکرائیں گے۔ یہ پہاڑ ذرات میں بدل جائیں گے۔ سمندر خشک ہو جائیں گے کیونکہ سورج اپنی کششِ ثقل کھو چکا ہوگا۔ اور پھر نہ تو یہ دنیا پہلی جیسی دنیا ہوگی اور نہ یہ سیارے اپنی موجودہ حالت پر قائم رہ سکیں گے۔ اور ایک دوسرے سے متصادم ہو کر ایک دوسرے میں مدغم ہو جائیں گے۔ اب جب کہ ہماری اس نظام شمسی کے کئی سیارے ہماری دنیا سے کئی گنا بڑے ہیں جن میں مشتری Jupitar: ہماری دنیا سے گیارہ گنا بڑا ہے۔ زحل Saturn: تقریباً دس گنا بڑا ہے۔ یورینس URANUS اور نیپچون Neptune: تقریباً چار گنا بڑے ہیں اور جب یہ سب ایک قیاس میں نہ آنے والے ملبہ میں بدل جائیں گے۔ اور پھر ایک قیاس میں نہ آنے والا عالم ہوگا۔

"جب آسمان شگافتہ ہو جائے گے۔ اور جب سیارے ٹوٹ کر گریں گے اور جب تمام دریا بہا کر خشک کر دئے جائیں گے (۸۲۔۱ تا ۳)۔

"پہاڑ ایسے ہو جائیں گے جیسے دھنکی ہوئی روئی (مختلف رنگوں کے پہاڑ چکنا چور ہو کر پھیل جائیں گے" (۱۰۱۔ ۳ و ۴)۔

"جب زمین تان دی جائے گی۔ اور جو کچھ اس میں ہے نکال کر خالی ہو جائے گی" (۸۴۔ ۳ تا ۴)۔

نہ یہ نظامِ شمسی ہوگا۔ اور نہ پہلے جیسا کوئی نظم وضبط ہوگا۔ اور اس وقت کے نظام کا ایک ایسا منظر ہوگا جس پر اس دنیا جیسا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ ان حالات کا اندازہ لگا لینے کے بعد جگہ کی تنگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس وقت اس نظامِ شمسی کے تمام سیارے ایک ہی ملبہ میں سمٹ کر ایک عظیم میدانِ حشر کی تشکیل کریں گے۔ ایک ایسی زمین کی تعمیر جس میں نہ بلندی ہوگی۔ نہ پستی ہوگی۔ نہ سمندر ہوں گے نہ پہاڑ ہوں گے اور زمین بھی تان کر ہموار کر دی جائے گی اور پھر مشیت خدا کے تحت ایک ایسا میدان پھیلا ہوگا جہاں کشادگی ہی کشادگی ہوگی۔

(۲) اس سلسلے میں کچھ لوگوں نے قرآن حکیم کی اس آیت پر طبع آزمائی فرمائی ہے کہ "جب کھالیں جل کر گل جائیں گی تو ہم ان کے لئے دوسری کھالیں بدل کر پیدا کر دیں گے تاکہ وہ عذاب کا مزہ چکھیں" (۴۔۵۶)۔ ان کا کہنا ہے کہ اس دوسری بدلی ہوئی کھال نے کیا گناہ کیا ہے جو اسے بھی عذاب کا شکار ہونا پڑے گا! جب کہ عین حقیقت ہے کہ کھال (مادہ) محض شکلیں بدلتا رہتا ہے۔ وہ جل کر پگھل سکتا ہے۔ کوئلہ اور راکھ ہو سکتا ہے اور پھر عالمی نظریہ کے تحت خدا کی قدرت کاملہ سے دوبارہ پہلی شکل

[illegible]

[illegible]

ابتدائی ضروریات زندگی کے تمام اسباب ایسے دانشورانہ طرز سے فراہم اور مہیا ہوتے ہیں جو ایک واحد خلیہ کے وارفتگی کے ساتھ پروان چڑھنے کی خاطر ایک مدّت معیّنہ تک کے لئے خود کفیل ہوتے ہیں۔

غور کرنے پر اس کیپسول میں جسم کا ایک مکمل ننھا سا ڈھانچہ۔ مرکز قواء۔ پرورش کے سامان۔ تیزابی اور حیاتیاتی غذائیت۔ پروٹین۔ لحمینہ۔ متحرک جوہری مادّہ کا مرکز۔ تقریبی فطرات۔ یہاں تک کہ اس کے قیافہ اور رنگ کا مادّہ۔ کچھ سادہ نہاں خانے کچھ چھپے ذرّات۔ کچھ ساکن اور خاموش مگر جاندار گوشے غرضکہ ہر وہ چیز جو زندگی کی وارفتگی کے ساتھ پروان چڑھنے اور بڑھنے کے لئے ایک معیّنہ مدّت تک کے لئے کافی ہوتے ہیں۔ اس مدّت میں ان خلیوں کی تعداد اس قدر ہو جاتی ہے کہ ایک مسلّم اور مکمل انسان وجود میں آجاتا ہے۔ خلیہ قدرت خداوندی کا ایک عظیم شاہکار ہے۔

اس طرح خلیہ کی بنیادی حقیقت کو سمجھ لینے کے بعد اس قسم کے اعتراض کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا۔ اور یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جب ہمارا وجود محض ایک واحد خلیہ سے شروع ہوتا ہے اور پھر خلیوں کی کثرت سے ہمارے مکمل جسم کی تشکیل ہو جاتی ہے۔ اور جب کہ ہمارے ابتدائی خلیہ میں سارے جسم۔ اعزاء اور شخصیت کی حقیقت پنہاں ہوتی ہے۔ تو اسی ایک خلیہ میں دوبارہ مکمل انسان کے پیدا ہونے کی صلاحیت بھی ہوتی ہے۔ اور اس طرح روز محشر ہمارے دوبارہ تشکیل ہو جانے کے لئے محض ایک خلیہ واحد (تخم لازوال) ہی کافی ہوگا۔ اور شاید اسی حکمت کے تحت قادر مطلق نے ابتدائی خلیہ کے مثل "تخم لازوال" کو ہمیشہ باقی رکھا ہے جس کی طرف امام جعفر صادقؑ نے "خاک مستدیر" کہہ کر اشارہ کیا ہے۔ اور یہی "تخم لازوال" روز قیامت تک

کے لئے زیر زمین اور خاک میں مل کر اپنے دوبارہ زندہ ہو اٹھنے کے لئے اپنی تمام داخلی قوت نمو کے ساتھ ساکن مگر بیدار رہے۔ تخم لازوال کا اجمالی ذکر قیامت کا پس منظر کے تحت آیا ہے۔

انسان خود ایک عظیم طاقت کا منبع ہے اور اس کی تخم لازوال یا خاک مستدیر تو اپنے تمام پچھلے خلیوں کا نچوڑ۔ جوہر اور خلیفہ ہوتا ہے اور خصوصاً روز محشر جس دن تمام طاقتیں آزاد ہوں گی اس وقت یہ تخم لازوال جو زیر زمین رہنے کے بعد بھی ایک عظیم طاقت کا منبع ہوتا ہے۔ متغیّر ہو کر ایک بار پھر اپنی گزشتہ دور حیات کے بہترین اور نوجوان شکل میں بیدار ہو کر اٹھ کھڑا ہوگا۔

موت

موت کا عنوان "حیات بعداز موت" کے سلسلے کی اہم ترین کڑی ہے۔ انسان کی ارتقائی منزلوں کے ساتھ ساتھ موت کی حقیقت معلوم کرلینے کی تحقیق اور کاوشیں جاری رہی ہیں۔ موت ایک ایسا سربستہ راز ہے جس پر آج تک نہ تو پردہ اُٹھ سکا اور نہ موت پر قابو پایا جاسکا۔ اس عنوان کے تحت حضرت علیؑ کے ارشادات غور طلب ہیں۔

"اے لوگو۔ ہر شخص اس چیز کا سامنا کرنے والا ہے جس سے وہ فرار اختیار کئے ہوئے ہے۔ جہاں زندگی کا سفر کھینچ کرلے جاتا ہے وہی حیات کی منزل منتہا ہے۔ موت سے بھاگنا اسے پالینا ہے۔ میں نے موت کے چھپے ہوئے بھیدوں کی جستجو میں کتنا ہی زمانہ گذارا مگر مشیت ایزدی یہی رہا کہ اس کی (تفصیلات) بے نقاب نہ ہوں۔ اس کی منزل تک رسائی کہاں۔ وہ تو ایک پوشیدہ علم ہے۔"
(نہج البلاغہ)

موت ایک رازِ کبریائی۔ ایک علم خفتہ۔ ایک کبھی حل نہ ہونے والا سوال۔ اور کسی یقینی اور پختہ نتیجہ پر نہ پہنچ سکنے والا فلسفہ ہے پھر بھی ذہن انسانی اپنے ذہن وادراک۔ سانحات۔ مشاہدات۔ علم طب۔ فلسفہ اور ارشادات معصومین کی روشنی میں اس رازِ سربستہ کو حل کرنے کی کوشش کرتا رہا ہے۔ اور اس سلسلے میں جو کچھ بھی حاصل کرسکا ہے ہم انھیں قارئین کے سامنے پیش کردینا ضروری

سمجھتے ہیں۔

علم انسانی سے بہت پہلے ابن آدم کے انتہائی تاریک دور میں بھی لوگ پیدا ہوتے تھے اور مرتے تھے۔ نہ تو اس وقت آج جیسی میڈیکل سائنس تھی، نہ طبی آلات اور نہ انسان کو اپنے جسم کے بارے میں کسی طرح کی معلومات ہی تھی۔ جب اُسے اعضاءِ انسانی اور اعضائے رئیسہ کس طرح کا اور کون کون سا کام کرتے ہیں کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ اس وقت انسانی جسم ایک رازِ سربستہ تھا اور خود انسان ایک حل نہ ہوسکنے والا معمہ جس کو انسان نے نہ تو سمجھا تھا اور نہ سمجھنے کی کوشش کرتا تھا۔ یہ تو بس انسان کی ابتدائی عقل و تمیز کی برکتیں ہی تھیں جن سے وہ سمجھ پاتا تھا کہ آدمی مرگیا ہے۔ اس کے لئے سانس کا بند ہوجانا۔ دل کی دھڑکنوں کا رک جانا۔ نبض کا ساکت ہوجانا سانس کا رک جانا۔ زیادہ سے زیادہ کان رکھ کر دل کی دھڑکن سنی۔ کلائی پر ہاتھ رکھ کر نبض کا جائزہ لیا ناک پر ہاتھ رکھ کر سانس کا احساس کیا۔ سینہ کا زیر و بم دیکھا۔ اور جب یہ بات متفقہ طور سے طے ہوگئی کہ جسد انسانی نے اپنا کام بند کردیا ہے تو اُسے ایک مُردہ لاش تصور کرکے چادر سے ڈھک دیا اور پھر اپنے رواج کے مطابق اس کے آخری رسوم کی تیاریاں شروع کردیں۔ آج بھی دنیا کے تاریک ترین علاقوں میں جہاں طبی سہولیتیں ناپید ہیں انھیں پیمانوں پر جانچ کرنے کے بعد موت کا اعلان کردیا جاتا ہے۔ معاشرہ کے ابتدائی دور میں انسان کے جسم کو چیر کر اس کے اندرونی اعضاء رئیسہ کو غور کرنا بھی ایک اخلاقی جرم اور مردہ کے ساتھ بے حرمتی کا مترادف تھا۔ اور اکثر علاج معالجہ کے لئے جادو۔ ٹونا۔ منتر اور روحوں کے خیالی اور توہماتی عقائد

کار فرماں تھے۔

حقیقی معنوں میں میڈیکل سائنس اور چیر پھاڑ ولیم ہاروے کے زمانہ میں وجود میں آئے۔ جس نے دریافت کیا کہ خون رگوں اور شریانوں کے ذریعہ سے سارے بدن میں دوڑتا رہتا ہے۔ دل ایک پمپنگ اسٹیشن ہے۔ جسم کا تمام خراب اور فاسد خون شریانوں کے ذریعہ سے پھیپھڑوں میں صفائی کے لئے چلا جاتا ہے اور پھر وہی خون صاف ہوکر دوبارہ شریانوں کی مدد سے دل میں آتا ہے۔ جہاں سے وہ دوبارہ پمپ کر کے شریانوں کے ذریعہ تمام جسم میں بھیج دیا جاتا ہے اور سب سے تازہ اور خالص خون دماغ کو بھیجا جاتا ہے۔ اس کے بعد "پاسچر" نے جراثیم کا پتہ لگایا اور پھر تو اس کے بعد میڈیکل سائنس میں روز افزوں ترقی ہونے لگی۔ جراحی اور چیر پھاڑ کے علم نے ایسی حیرت انگیز ترقی کی جس نے موت کے عنوان کو ہی ایک نئی شکل دے دی اور اب یہ دور آگیا ہے کہ میڈیکل سائنس جسم کے اعضاءِ رئیسہ کے رک جانے کو موت نہیں مانتی جس کی مثال مسز اندرا گاندھی کی موت سے دی جاسکتی ہے کہ ان پر تقریباً نو بج کر دس منٹ پر ریوالور کی پانچ اور اسٹین گن کی پچیس گولیاں ماری گئیں جو خود ان کے محافظوں نے بہت قریب سے ماری تھیں۔ ظاہر ہے کہ اس سے ان کی موت جائے حادثہ پر ہی ہو گئی تھی اور پھر انھیں آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنس لے جایا گیا۔ جہاں ڈاکٹروں نے مل کر گھنٹوں انھیں دوبارہ زندہ کرنے کی کوششیں کیں اور آخر کار ہر طرح سے ناکام ہوجانے کے بعد تقریباً دو بجے دن میں انھیں مردہ قرار دیا گیا اور یہ اعلان اس وقت کیا گیا جب ماہرین اور سرجن ہر طرح سے ناکام ہو گئے۔

یہ واقعہ اس بات کا شاہد ہے کہ علم سرجری اب اس عروج پر ہے جہاں جسم کے اعضاءِ رئیسہ کے معطل ہوجانے کے بعد بھی اگر ان پر وقت معینہ کے اندر عمل کیا جائے تو انھیں دوبارہ زندہ کیا جاسکتا ہے بشرطیکہ جسم اس قابل ہو کہ دوبارہ زندہ ہوجانے کے بعد وہ از خود زندہ رہ سکے یا اُسے کوئی ایسی جان لیوا بیماری نہ ہو جس سے اس کی زندگی تلف ہو سکے۔ یا اُسے مرے ہوئے اتنا عرصہ نہ گزر گیا ہو جس سے اس کے دماغی سلز CELLS بے جان ہو چکے ہوں۔ آج کی میڈیکل سائنس انسانی دماغ کے خلیوں کے مرجانے کو ہی اصل موت مانتی ہے۔ یہ دماغ ہی ہے جسے زیادہ سے زیادہ آکسیجن اور صاف خون کی ضرورت ہوتی ہے اور اگر خون کی سپلائی ایک بار اتنی مدت تک کے لئے رک گئی اور دماغی خلئے مر گئے تو پھر ان کا دوبارہ زندہ ہونا ممکن نہیں ہے۔

جب رُکی ہوئی سانس دوبارہ لائی جاسکتی ہے۔ جب دل کی دھڑکنیں دوبارہ شروع کی جاسکتی ہیں اور جب پھیپھڑے دوبارہ کام شروع کرسکتے ہیں تو ان دونوں کی مدد سے دوران خون کو ایک بار پھر بحال کیا جاسکتا ہے جو انسانی جسم کی مشینری کے چلانے کے لئے جوہر سیال ہے اور دماغ کے خلیوں کو زندہ رکھ سکتا ہے اور انسان اس وقت تک مُردہ تصور نہیں کیا جاسکتا جب تک اس کے دماغ کے خلئے زندہ ہیں۔ ہاں جب دوران خون بند ہو جانے کے بعد ایک مدت معینہ تک یہ جوہر سیال دماغی خلیوں تک نہیں پہنچ پاتا تو دماغ کے خلئے مرنے لگتے ہیں جن کے مرنے کے بعد انسانی زندگی کی ساری امیدیں منقطع ہوجاتی ہیں۔ یہ مدت معینہ بھی ہر انسان کی الگ الگ ہوتی ہے کسی

کی دو گھنٹہ تو کسی کی آنکھ لگنے تک۔

اس سلسلے میں ضروری ہوگا اگر ہم امام جعفر صادقؑ کی ان تعلیمات کا ذکر کریں جو آج سے چودہ سو سال قبل آپ نے ابوشاکر کو دی تھیں۔ اور جو آج تک کے تمام طبّی نظریات اور معلومات کا نچوڑ ہیں۔ آپ نے فرمایا ہے کہ "ہر قسم کی ناگہانی موت آخری مرحلے میں خون کی غفلت (جو اس کی روانی میں رکاوٹ بن جاتی ہے) سے واقع ہوتی ہے۔ موت جسمانی اعمال و افعال کا وقفہ اور بالخصوص حرکت قلب کے بند ہوجانے سے آجاتی ہے۔ خون میں جب غفلت اور رکاوٹ آجاتی ہے تو دل، دماغ اور خود خون میں ناگہانی امراض عارض ہوکر انسان کو ہلاکت تک پہنچا دیتے ہیں۔" اس میں تو شک ہی نہیں کیا جاسکتا کہ زندگی خدا کا ایک قیمتی عطیہ ہے مگر ساتھ ہی ساتھ اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ موت مقدم ہے اور خدا کا حکم بھی یہی ہے کہ "ہر جاندار کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔" (۳-۸۵)

میڈیکل سائنس نے تو موت کے اتنے اسباب بتلائے ہیں جن کا شمار نہیں کیا جاسکتا۔ ہاں اگر اسے اختصار کے ساتھ سمجھنا ہے تو تعلیمات معلّمان علم وحی کی طرف رجوع کرنا ہوگا اور ہدایات معصومینؑ کا سہارا لینا ہوگا۔ اس سلسلے میں امام جعفر صادقؑ کے اس مکالمہ کے کچھ اقتباسات پیش کر دینا ضروری ہوگا۔ جو آپ نے ابوشاکر کے سوالات پر کیا ہے۔

ابوشاکر۔ کیا بات پیدا ہوتی ہے کہ ہمارا دل، دماغ اور خون ہم کو دفعتاً ہلاکت میں ڈال دیتا ہے!

جعفر صادقؑ۔ ہر قسم کی ناگہانی موت آخری مرحلہ میں خون کی غفلت اور رکاوٹ سے

واقع ہوتی ہے۔ اور خون کی غفلت بھی گوشت اور دیگر قوت دار غذاؤں کے افراط اور کثرت استعمال سے پیدا ہوتی ہے۔ جب خون غلیظ ہوجاتا ہے تو دل، دماغ اور خود خون میں ناگہانی امراض عارض ہوجاتے ہیں اور انسان کو ہلاکت تک پہنچا دیتے ہیں۔ جو عرب قبائل صحراؤں میں زندگی بسر کرتے ہیں ان کو کبھی طبعی عمر سے پہلے مرتے نہیں دیکھا گیا۔ کیونکہ صحرانشین عرب گوشت اور دیگر مقوی غذائیں کم کھاتے ہیں اور بعض قبائل تو سال میں صرف ایک بار گوشت استعمال کرنے کے لئے مکہ معظمہ جاتے ہیں تاکہ حج کے موقعہ پر جو قربانیاں ہوتی ہیں اور کوئی ان کا خواہش مند نہیں ہوتا اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں ورنہ وہاں سے واپس آنے کے بعد پہلے کی طرح دودھ اور اگر میسّر آگیا تو خرما ان کی غذا ہوتی ہے۔ اس لئے ان کا خون غلیظ نہیں ہوتا جس سے مرگ مفاجات کا خطرہ درپیش ہو۔

ابوشاکر۔ میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ موت کیا چیز ہے۔!

جعفر صادقؑ۔ موت انسانی جسم کے اعمال و افعال کا وقفہ۔ بالخصوص حرکت قلب اور سانس کا رک جانا ہے۔

ابوشاکر۔ کیا ہوتا ہے کہ انسان مرجاتا ہے۔!

جعفر صادقؑ۔ انسان دو چیزوں سے مرتا ہے۔ ایک بیماری اور میں کہہ چکا ہوں کہ جو لوگ مرگ مفاجات میں مبتلا ہوتے ہیں۔ وہ اگرچہ اپنے کو تندرست سمجھتے ہیں لیکن اندرونی طور پر بیمار ہوتے ہیں اور وہ بھی بیماری سے ہی مرتے ہیں۔ اور دوسری وجہ جس سے موت واقعہ ہوتی ہے بڑھاپا ہے کیونکہ آدمی اگر صحیح سالم ہو تب بھی آخرکار بڑھاپے سے مرجائے گا۔ یونان کا ایک قدیم معالج اور حکیم بقراط کہتا ہے کہ بڑھاپا بھی ایک قسم

کی بیماری ہے۔ اور جس روز اس بیماری کا علاج دریافت ہو جائے گا انسان کو موت سے چھٹکارہ مل جائے گا۔

ابوشاکر۔ لیکن ہمارے اطبا اور معالج تو اس بیماری کا علاج نہیں کر سکتے۔!

امام جعفر صادقؑ۔ نہیں اے ابوشاکر۔ اور میرا عقیدہ ہے کہ طبیب اور معالج اس مرض کا علاج ہرگز نہیں کر سکیں گے۔ اس لئے کہ موت مشیت ایزدی ہے۔ اور چونکہ خدا کی مصلحت اور قدرت نے موت کو پیدا کیا ہے لہٰذا طبیب اور معالج اتنی قوت نہیں رکھتے کہ مرض پیری کا علاج کر سکیں۔ کیونکہ خدا نے یہ بات مقرر کر دی ہے کہ موت آئے۔ اور جو کچھ خدا مقرر کر دے اس میں کوئی تغیر نہیں ہو سکتا۔ خدا کا ارشاد ہے کہ موت موجود ہے۔ اور سوائے خدا کے ہر ایک کو موت آئے گی۔ موجودات کے اندر ایک تبدیلی سے دوسری تبدیلی اور ایک حال سے دوسرے حال میں منتقل ہونا ہے۔ کوئی چیز ایک حال پر باقی نہیں رہتی۔ حتیٰ کہ اگر خدا نے افراد بشر کے لئے موت ضروری قرار نہ دی ہوتی۔ جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں تب بھی نوع انسان کی بھلائی اسی میں ہے کہ موت کا سلسلہ قائم رہے۔ انسانی زندگی کو قائم رکھنے کے لئے موت اس قدر ضروری ہے کہ اگر یہ نہ ہوا ور آدمی باقی رہنا چاہے تو اسے موت ایجاد کرنی پڑتی۔ تاکہ لوگ مرتے رہیں اور موت کے نتیجے میں نوع بشر باقی رہے۔ اور اس کی نسل منقطع نہ ہو۔

ابوشاکر۔ پھر لوگوں کے اس قول کا کیا مطلب ہے کہ بعض گزشتہ پیغمبروں نے جاودانی زندگی پائی اور اب بھی زندہ ہیں۔!

جعفر صادقؑ۔ اے ابوشاکر تم اس پر اعتبار نہ کرو۔ کیونکہ دنیا میں اب تک کوئی ایسا آدمی پیدا نہیں ہوا جو مرا نہ ہو۔ یا اگر ابھی زندہ ہے تو آئندہ نہ مرے۔ یہ بات جو کہی جاتی

ہے کہ بعض پیغمبر زندۂ جاوید بن چکے ہیں۔ جو نہ کبھی مرینگے اور نہ مرے ہیں۔ اس کی حقیقت ایک افسانے سے زیادہ نہیں ہے۔ تمام پیغمبروں میں ہمارے پیغمبر جن پر تم ایمان نہیں رکھتے افضل اور برتر خاتم النبیین تھے لیکن آپ نے بھی رحلت فرمائی۔

ابوشاکر۔ آپ کا خدا تو یہ کہتا ہے کہ ہر شخص کی موت کا وقت معین ہے اور وہ نہ ایک ساعت پہلے مرتا ہے اور نہ ایک ساعت بعد میں۔ لیکن آپ کہتے ہیں کہ جو شخص گوشت کھاتا ہے وہ جلد مر جاتا ہے۔ اور اپنے اس قول کے ذریعہ سے آپ خدا کے کلام کا انکار کرتے ہیں۔

جعفر صادقؑ۔ اول تو میں نے یہ کہا ہی نہیں کہ جو گوشت اور مقوی غذائیں زیادہ مقدار میں استعمال کرتے ہیں وہ مرگ مفاجات کا شکار ہو ہی جاتے ہیں بلکہ کہا کہ بعض اشخاص کے لئے گوشت اور دیگر مقوی غذائیں استعمال کرنے سے مرگ مفاجات کا امکان رہتا ہے۔ دوسرے عمر طبعی اور اس عمر میں جسے انسان اپنے ہاتھوں کم کر لیتا ہے فرق ہے۔ عمر طبعی وہ ہے جو ایک آدمی معمولی اور عادی حیثیت سے گزارتا ہے اور جیسا کہ خدا کا ارشاد ہے اس عمر کی ایک مدت معین ہوتی ہے جس کے ختم ہونے پر آدمی مر جاتا ہے۔ نہ ایک ساعت قبل اور نہ ایک ساعت بعد۔ لیکن دوسری قسم میں انسان خود اپنے ہاتھوں موت بلا لیتا ہے۔ اور یہ موت طبعی موت سے جداگانہ ہوتی ہے۔ اور اس کو خودکشی کہنا چاہیئے۔ جو شخص تلوار سے اپنا گلا کاٹ لے اور اپنے کو ہلاکت میں ڈال دے وہ خدا کے اس ارشاد کے تحت نہیں آتا کہ موت کا وقت بدل نہیں سکتا۔ ہو سکتا ہے کہ خدا نے اسکی عمر نوے سال یا سو سال معین کی ہو لیکن وہ جوانی میں ہی خنجر کی ایک ضرب سے اپنی زندگی تباہ کر لیتا ہے۔ اسی طرح گوشت اور دوسری مقوی غذائیں استعمال کرکے اپنے خون کو غلیظ بنانے

والا بھی خودکشی کے لئے زمین ہموار کرتا ہے۔ کیونکہ غلظت خون ناگہانی موت کا باعث ہوتی ہے۔

امام جعفر صادقؑ کے مخصوص نظریات میں سے ایک نظریہ انسان کے طول عمر سے متعلق ہے۔ آپ نے فرمایا ہے کہ "آدمی اس لئے پیدا کیا گیا ہے کہ طولانی عمر بسر کرے لیکن وہ اپنی عمر کو کوتاہ کر لیتا ہے"۔ اگر انسان اسلامی قوانین پر عمل کرے، منہیات سے پرہیز کرے اور اسلامی دستور کے مطابق خورد نوش میں اسراف نہ کرے تو لمبی عمر سے بہرہ مند ہوگا۔ "طول عمری کا مسئلہ دو چیزوں سے وابستہ ہے۔ ایک اپنی صحت اور تندرستی کی حفاظت اور دوسرے پرخوری سے پرہیز۔"

پہلی صدی عیسوی میں روم کے لوگوں کی اوسط عمر صرف ۲۲ سال ہوتی تھی کیونکہ اُس وقت وہاں کے لوگ صحت پر زیادہ توجہ نہیں دیتے تھے اور نہ انہیں اس سلسلے میں کوئی معلومات ہی تھی۔ وہ عمدہ اور مرغن غذائیں اعتدال سے بہت زیادہ کھا لیتے تھے۔ وہاں کے بڑے اور متمول لوگوں کی دیکھا دیکھی عوام بھی مرغن غذاؤں کی پرخوری کرتے تھے۔ روم کے معززا اور امراء کے کھانے کے کمرہ سے ملحق ایک کوٹھری بھی ہوتی تھی جسے "ویمی ٹوریم" یعنی قے کرنے کی جگہ کہا جاتا تھا۔ اور اگر زیادہ کھا لینے کی وجہ سے فطری طور پر تسلی نہیں ہوتی تھی تو لوگ اس کے اندر جا کر عمداً قے کر کے خود کو ہلکا کر لیتے تھے۔ اور پرخوری کی وجہ سے موت سے بچتے تھے ——— موجودہ طبی سائنس کی ترقی کے دور میں بھی اگر مرض سرطان قابل علاج ہو جائے اور اگر قلبی امراض۔ دماغی سکتے اور خون کے جمنے کی وجہ سے خون کی رکاوٹ کا علاج ہو سکے پھر بھی انسان کی اوسط عمر دو سال سے زیادہ نہیں بڑھے گی۔ کیونکہ جو چیزیں اوسط عمر میں اضافہ کرتی ہیں وہ

چند مہلک بیماریوں کا علاج نہیں ہے بلکہ ہر موقعہ پر غذاؤں اور مشروبات کے سلسلے میں اصول اور قواعد کا لحاظ ضروری ہے۔ اگر انسان ان تمام چیزوں سے مکمل پرہیز کرے، پھر بھی وہ بڑھاپے کی وجہ سے ضرور مرے گا۔ بڑھاپا موت کا سبب بن جاتا ہے اور بڑھاپے میں تمام اعضاء بدن فرسودہ اور کمزور ہو جاتے ہیں اور ایسی حالت میں قابل علاج امراض بھی پیغام اجل بن جاتے ہیں۔ آخیر میں موت کے سلسلے میں امام جعفر صادقؑ کے کچھ مزید ارشادات کا لکھ دینا بھی انتہائی اہم اور معلوماتی ہوگا۔

آپ نے فرمایا کہ "ایک کافر معاد پر عقیدہ نہ رکھنے کی وجہ سے موت سے خوف کھاتا ہے کیونکہ وہ موت کی حقیقت سے واقف نہیں ہے اور وہ اپنی دنیاوی مسرتوں سے محروم ہو جانے کے خوف سے ڈرتا ہے۔ لیکن مسلمان موت سے اس لئے خائف نہیں ہوتا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ مرنے کے بعد دوسری دنیا میں اس کے لئے اس دنیا سے بدرجہا بہتر خوشیاں ہیں۔ وہ جانتا ہے کہ اس دنیا کی مدتیں محدود ہیں۔ ویسے کافر کو بھی عقلاً موت سے ڈرنا نہیں چاہئے کیونکہ موت کے بعد کی دنیا سے وہ ناواقف ہی ہے اور ناواقف سے خوف کھانا عقل کے خلاف ہے۔ وہ موت سے خائف محض اس وجہ سے ہوتا ہے کیونکہ موت کے بعد کے حالات کو اس نے انتہائی خوفناک بنا رکھا ہے۔ موت فنا کا نام نہیں ہے۔ حکمت کا یہ اصول ہے کہ جو چیز وجود میں آگئی پھر وہ فنا نہیں ہوتی۔ وہ کسی نہ کسی شکل میں باقی رہتی ہے۔ مادہ کے نیست و نابود اور فنا ہو جانے کے ضمن میں موت کا کوئی وجود نہیں ہے۔ البتہ شکل بدل جانے کے مفہوم میں موجود ہے۔ عالم ہستی میں صرف ایک ہی چیز ایسی ہے جس میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوتا اور وہ خدا کی ذات ہے۔ ورنہ اس کے علاوہ ہر شے اپنی شکل بدلتی ہے۔

جابر بن حیان کے استفسار پر "کہ کیا آپ موت کو تکلیف دہ اور دردناک سمجھتے ہیں" امام جعفر صادقؑ نے فرمایا۔ "نہیں اے جابر موت تکلیف دہ اور دردناک نہیں ہوتی۔ انسان کی ساری بیماریاں۔ درد اور تکلیف زندگی سے وابستہ ہیں۔ آدمی جب تک زندہ ہے وہ بیماریوں۔ زخموں اور ضربات کی وجہ سے تکلیف محسوس کرتا ہے۔ لیکن جس وقت روح بدن سے جدا ہو جاتی ہے اور موت آ جاتی ہے تو انسان موت سے کسی تکلیف اور درد کا احساس نہیں کرتا۔

عالمِ برزخ

عربی میں "برزخ" دو چیزوں کے درمیانی حدِ فاصل کو کہتے ہیں۔ دنیاوی (فانی) زندگی اور اخروی (دائمی) زندگی کے درمیان ایک عالم ہے اور دین اسلام کے مطابق وہی عالم برزخ ہے۔ جس کا ذکر قرآن حکیم میں کئی جگہ آیا ہے۔

"اور ان کے مرنے کے بعد عالم برزخ ہے جہاں اس دن تک کہ دوبارہ قبروں سے اٹھائے جائیں رہنا ہو گا۔" (۲۳۔ ۱۰۰)

مرنے کے بعد عالم برزخ میں انسان کی ترتیب نو اس طرح سے ہوتی ہے کہ اس کا جسدِ خاکی تو قیامت تک کے سپرد خاک ہو جاتا ہے اور وہ اپنے مادۂ تعمیری میں مل جاتا ہے جہاں فطری طور پر یہ مادہ منتشر ہوتا رہتا ہے اور شکلیں بدلتا رہتا ہے کبھی گیاہ نباتات کی شکلوں میں تو کبھی پھلوں اور پھولوں کی شکلوں میں انسانوں اور حیوانوں کی غذائیں بن جاتا ہے۔ یہاں تک کہ قدرت الٰہی کے تحت ایک دن پھر اپنی حالت حالت میں ایک توانا اور تندرست انسان مجسم بن کر میدان حشر میں حاضر ہو جائے گا۔

مگر اس کی روح غیر مادی ہونے کے سبب سے نہ تو فنا ہوتی ہے اور نہ شکلیں بدلتی ہے اور نظام قدرت کے تحت اُسے ایک ایسا مثالی اور لطیف جسم عطا ہو جاتا ہے جو مادی جسم سے سبک مگر قوی اور غیر متغیر ہوتا ہے۔ روح کو اسی لطیف جسم میں قیامت تک رہنا ہو گا یہاں تک کہ یوم بعثت وہ دوبارہ اس مثالی جسم کو ترک کر کے ایک بار پھر اپنے مادی جسم میں داخل ہو جائے گی اور پھر اُسی مادی جسم کے ساتھ

حضور خداوندی میں حاضر ہوگی۔

قانون قدرت بھی یہی کہتا ہے کہ جب روح ایک لافانی اور غیر مادّی شے ہے تو اس جوہر اولیٰ کو یوں بھٹکنے کے لئے نہیں چھوڑ دے گا بلکہ اس کے اعمال سابقہ کے مطابق خدا اُسے اس زمانۂ دراز تک کے لئے کوئی جائے مستقر ضرور دے گا۔ برزخ خود ایک عالم مثالی ہوگا۔ بالکل اسی دنیا کے مانند جہاں جانے کے بعد ہم اسی طرح محسوس کریں گے جس طرح شکم مادر سے مادّی دنیا میں آنے پر محسوس کرتے ہیں۔ برزخ کا مثالی جسم مادّی جسم جیسا ہی ہوگا مگر وہ مادّی نہ ہو کر ہوا سے بھی زیادہ لطیف ہوگا اس کے کوئی چیز مانع نہیں ہوگی۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا ہے کہ "اگر تم اس مثالی جسم کو دیکھو گے تو کہو گے کہ یہ تو بالکل وہی جسم ہے۔ اس وقت اگر تم اپنے باپ کو دیکھو گے تو انھیں اسی دنیاوی جسم میں سمجھو گے حالانکہ ان کا مادّی جسم تو قبر کے اندر ہوگا۔"

عالم برزخ میں روحِ انسانی تمام مادّی اور خاکی بندشوں سے آزاد ہو جاتی ہے۔ وہاں نہ تو اسے زمان و مکان کی قید ہوتی ہے اور نہ کسی طرح کی بندش اس کی سدِ راہ ہو سکتی ہے۔ عالم برزخ کی عظیم کائنات میں وہ اس کی لامحدود وسعتوں تک جہاں چاہے جا سکتا ہے۔ عالم برزخ میں اس کی رفتار بھی پرواز تخیل کے ساتھ ساتھ ہوتی ہے۔ وہاں اس کی روح تمام نفسانی شہوتوں اور آلودگیوں سے پاک ہوتی ہے۔ اس کی نگاہوں میں بلا کی وسعت اور درازی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور اس وقت وہ اپنی اس دنیاوی اور مادی زندگی کو ایک خواب سے زیادہ نہیں سمجھتا۔ روح اپنے مثالی جسم میں جس وقت اور جہاں چاہے سفر کر سکتی ہے۔

عالم برزخ میں مومنین متقین۔ شہدا اور صالحین کی روحیں آزاد۔ پرسکون

شادمانیوں اور مسرتوں میں ڈوبی ہوئی ہوں گی۔ کیوں کہ دنیا میں وہ خود کو مادّی اور خاکی جسموں میں مقید محسوس کر رہی تھیں۔ کمزور۔ حقیر اور رو بہ زوال میں مجبور اور محصور۔!! مگر اب نہ تو ان پر کسی طرح کی بندش ہوگی اور نہ ان کے لئے زمان و مکان کی کوئی مجبوری اور تردّد۔ وہاں پر ان روحوں کو ان کے اعمال صالحہ۔ تقویٰ اور پرہیز گاری کے مطابق اعلیٰ درجات اور مقامات ہوں گے۔ وہاں پر وہ اپنے دنیاوی اعمال صالحہ اور رضائے الٰہی کے لئے پیش کی گئی قربانیوں کے صلہ میں بلند درجات حاصل کریں گی اور وہ خود کو بڑا خوش نصیب اور فائض المدام محسوس کریں گی۔ ان کے سامنے پر کیف مناظر ہوں گے اور ہر طرح کی دلوں کو محصور کر دینے والی نعمتیں ہوں گی۔ ان کے احساسات ہر طرح آلودگیوں اور نجاستوں سے پاک ہوں گے۔ ہر طرح کی دلفریبیاں ان کے لئے فراہم اور دستیاب ہوں گی۔ اللہ کے نیک بندوں کے لئے وہاں پر ہر طرح کی دلفریبیاں ہوں گی اور دل خوش کرنے کے ہر جائز اور پاک طریقے ہوں گے۔ جن میں نہ کسی طرح کی بندش ہوگی اور نہ رکاوٹ ہوگی۔ وہاں پر نہ تو ان کو کبھی کوئی مرض ہوگا اور نہ کمزوری۔ ان کے لئے ہر طرف نور۔ جمال۔ الفت۔ اور محبت بکھری ہوئی ہوگی جن میں نہ ریاکاری ہوگی۔ نہ مکاری اور نہ نفاق۔ عالم برزخ میں اللہ کے مقرب بندے ان کے ہم نشین ہوں گے جن کے ساتھ ان کے معاشرت کے اور اکٹھا رہنے کے طریقے ہوں گے۔ وہاں ان کی صحبتیں متقین اور قابل فخر و تعظیم ہستیوں کے ساتھ ہوں گی۔ عالم برزخ میں ان کو ان کی ضرورتوں کے مطابق بہترین اور لطیف رزق بھی ہوگا۔ مشروب بھی ہوں گے اور وہاں پر ان کے لئے ہر وہ چیز ہوگی جس کی وہ خواہش کریں۔ گویا عالم برزخ میں انھیں

بہشت جیسی بہاروں اور نظاروں کا لطف حاصل ہوگا۔ جو آخر کار بہشت کے لازوال نعمتوں سے جا ملے گا۔

اس سلسلے میں کچھ لوگوں کے اس احتمال کا ازالہ کر دینا بھی ضروری ہے جو کہتے ہیں کہ جب ہمارا جسم ہی نہ ہوگا تو پھر ہم برزخ کی نعمتوں کا لطف کیونکر حاصل کر سکیں گے۔

اس کی وضاحت علم وہبی رکھنے والے امام جعفر صادقؑ کی ان تعلیمات سے ہو جاتی ہے جو آپ نے جابر بن حیان کے استفسار پر دی ہیں۔ یہ تعلیمات اس قدر مدلل اور عالمانہ ہیں جن کے بعد پھر کسی طرح کے شک و شبہ کا احتمال نہیں رہ جاتا۔

جابر:۔ آیا آپ اس پر غور نہیں فرماتے کہ کافر موت سے اس لئے ڈرتا ہے کہ وہ سوچتا ہے کہ اس دنیا کی خوشیاں اور مسرتیں اس سے چھن جائیں گی۔

جعفر صادقؑ:۔ میں یہی کہتا ہوں کہ کافر اس دنیا کی مسرتوں سے محروم ہو جانے کے خیال سے ڈرتا ہے۔ لیکن مسلمان اس بناء پر موت سے خائف نہیں ہوتا کہ اس دنیا سے کہیں زیادہ خوشیاں دوسری دنیا میں اس کا انتظار کر رہی ہیں۔ اس دنیا میں اس کی مسرتوں کا زمانہ محدود ہے اور دوسری دنیا میں غیر محدود۔ کافر کو بھی موت سے عقلاً ڈرنا نہیں چاہئے کیونکہ موت کے بعد کی دنیا اس کے لئے بالکل ہی غیر معروف ہے۔ لیکن وہ اپنی عقل سے کام نہیں لیتا بلکہ دنیا کے بعد موت کو سمجھنے کے لئے خوف پیدا کرنے والے تصورات قائم کر لیتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ آغاز میں یہاں نہیں تھا بلکہ شکم مادر سے اس دنیا میں آیا ہے اور اگر یہاں سے چلا جائے گا تو پھر دوسری شکم مادر میں رہنا ہوگا۔ اس لئے وہ موت سے ڈرتا ہے۔ (شاید وہ اس وجہ سے بھی ڈرتا ہے کہ خدا جانے دوسرے جنم میں اُسے یہ سب مسرتیں حاصل

بھی ہوں گی یا نہیں۔ اس لئے وہ موجودہ زندگی کے عیش و طرب کو چھوڑتے ہوئے بھی مضطرب ہو جاتا ہے) لیکن اے جابر میں تم سے اسلام کے نظامِ فطرت کے تحت سوال کرتا ہوں۔ آیا تمہیں کبھی بیہوش ہونے کا اتفاق ہوا ہے۔

جابر:۔ (تھوڑی دیر سوچنے کے بعد) مجھے ایسا اتفاق نہیں ہوا ہے۔

جعفر صادقؑ:۔ آیا تم خواب دیکھتے ہو۔!

جابر:۔ خواب تو اکثر دیکھتا ہوں۔

جعفر صادقؑ:۔ آیا خواب میں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل بھی ہوتے ہو۔!

جابر:۔ اکثر نقل مکان کرتا ہوں۔

جعفر صادقؑ:۔ کس چیز کے ذریعہ سے نقل مکان کرتے ہو۔ کیونکہ یہ تو معلوم ہے کہ اس موقعہ پر چلتے نہیں ہو۔!

جابر:۔ میں اپنی روح کے ذریعہ سے منتقل ہوتا ہوں۔

جعفر صادقؑ:۔ کیا تم یہ عقیدہ رکھتے ہو کہ یہ روح تمہاری ہی ہے اور اس کی کوئی علاحدہ شخصیت نہیں ہے۔!

جابر:۔ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے۔

جعفر صادقؑ:۔ آیا یہ روح جو نقل مکان کرتی ہے تم سے جُدا ہوتی ہے یا نہیں۔!

جابر:۔ مجھ سے جُدا ہو جاتی ہے کیونکہ اگر مجھ سے جُدا نہ ہو تو میں نقل مکان نہیں کر سکتا۔

جعفر صادقؑ:۔ تمہاری روح جو تم سے جُدا ہو کر نقل مکان کرتی ہے کیا غذا بھی کھاتی ہے۔!

جابر:۔ ہاں غذا بھی استعمال کرتی ہے۔

جعفر صادقؑ:۔ آیا پانی بھی پیتی ہے۔!

جابر:۔ ہاں پیتی ہے۔

جعفر صادقؑ:۔ جس وقت تمہاری روح آب و غذا استعمال کرتی ہے تو کیا تمہارے منھ کے ذریعہ سے کھاتی ہے۔!

جابر:۔ نہیں۔ کیونکہ میرا منھ عالم خواب میں حرکت نہیں کرتا۔

جعفر صادقؑ:۔ باوجودیکہ اس کے پاس منھ نہیں ہے تم خواب کی حالت میں غذاؤں کا ذائقہ بھی چکھتے ہو۔ مشروب سے لطف اندوز بھی ہوتے ہو۔ بغیر پیروں کے راستہ بھی چلتے ہو۔ ایک مقام سے دوسرے مقام تک منتقل بھی ہوتے ہو۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ تمہاری روح ایک مستقل زندگی کی مالک ہے اور خواب کی حالت میں زندہ رہنے کے لئے اُسے جسم کی محتاج نہیں ہے۔

جابر:۔ لیکن اگر جسم نہ ہو تو میں خواب بھی نہیں دیکھ سکتا۔

جعفر صادقؑ:۔ تم خواب تو نہیں دیکھ سکتے لیکن میں پوچھتا ہوں کہ کیا تمہاری روح بغیر جسم کے باقی نہیں رہتی۔! میں تمہاری بات کی تصدیق کرتا ہوں کہ اگر تمہارا جسم نہ ہو تو تم خواب بھی نہیں دیکھ سکتے۔ لیکن اب میں پوچھتا ہوں کہ آیا خواب دیکھنے کی حالت میں جب کہ تمہاری روح ایک مستقل زندگی کی حامل ہوتی ہے۔ جہاں چاہتی ہے جاتی ہے۔ اور جو چاہے کرتی ہے اس کا وجود قائم رہتا ہے یا نہیں۔!

جابر:۔ ہاں رہتا ہے۔

جعفر صادقؑ:۔ آیا خواب کے عالم میں روح کی موجودیت اور اس کی مستقل زندگی کے بارے میں تمہیں کوئی شبہ ہے یا نہیں۔!

جابر:۔ مجھے کوئی شک و شبہ نہیں ہے۔

جعفر صادقؑ:۔ آیا تم حکمت (سائنس) کے اس اصول کو تسلیم کرتے ہو کہ جو چیز وجود میں آ جائے وہ فنا نہیں ہوتی۔!

جابر:۔ ہاں میں اس اصول کو تسلیم کرتا ہوں۔

جعفر صادقؑ:۔ پس تمہاری روح وجود میں آ چکی ہے۔ اور تمہیں اس کے وجود میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے کہ تمہاری روح مرنے کے بعد فنا نہیں ہوگی اور چونکہ جس چیز کو تم "میں" جانتے ہو وہ تمہاری روح ہے۔ لہٰذا تمہارا "میں" بھی باقی رہے گا اور تم مرنے کے بعد بھی خود کو پہچانو گے۔

جابر:۔ مجھے اس میں شبہ نہیں ہے کہ خواب دیکھنے کے وقت میری روح موجود ہوتی ہے لیکن یہ موجودیت انفرادی اور مستقل نہیں ہوتی بلکہ طبعی ہے۔ کیونکہ اگر میرا جسم نہ ہو تو میں خواب بھی نہیں دیکھوں گا۔ اور اگر خواب نہ دیکھوں گا تو اپنی روح کا جو مستقل اور مجرد زندگی کی مالک ہے مشاہدہ بھی نہیں کر سکوں گا۔

جعفر صادقؑ:۔ جس وقت آفتاب طالع ہوتا ہے اور تمہارا سایہ زمین پر پڑتا ہے وہ سایہ طبعی ہوتا ہے یا نہیں۔!

جابر:۔ طبعی ہوتا ہے۔

جعفر صادقؑ:۔ کس چیز کا تابع ہوتا ہے۔

جابر:۔ دو چیزوں کا۔ اول آفتاب کی روشنی۔ دوم میرا وجود۔ بغیر ان دو چیزوں کے سایہ وجود میں نہیں آتا۔

جعفر صادقؑ:۔ جب اصول حکمت (سائنس) کے مطابق تمہارا وہ سایہ بھی فنا نہیں

ہوتا جو زمین کے اوپر پڑتا ہے اور غروب آفتاب کے بعد بظاہر ختم ہو جاتا ہے توپھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ روح فنا ہو جائے چاہے اس کی زندگی طبعی ہی کیوں نہ ہو۔

اس مکالمہ میں امام معصوم کے نطق سے نکلے ہوئے علوم وہبی کے وہ بیش بہا خزانے ہیں جو علم سائنس کے لئے راہیں روشن کرتے ہیں اور اس مثبت مکالمہ کے بعد زیادہ طوالت میں پڑنے کی ضرورت نہیں رہ جاتی کہ روح اس مادّی جسم کو چھوڑ دینے کے بعد عالم برزخ میں کس طرح مسرور۔ اور شادمان ہو کر دنیاوی قید و بند سے آزاد زندگی گزارے گی۔ دنیا میں عالم برزخ کی مثال خواب کا دیکھنا ہے۔ خواب میں آدمی عجیب و غریب چیزوں کا مشاہدہ کرتا ہے۔ کبھی دیکھتا ہے کہ بہترین اور پرلطف نظاروں سے لطف اندوز ہو رہا ہے۔ کبھی دیکھتا ہے کہ آگ کے شعلوں میں جل رہا ہے۔ فریادیں کر رہا ہے۔ لیکن جاگنے کے بعد اپنے قریب کے لوگوں سے پوچھتا ہے کہ میری آواز سُنی تھی تو وہ انکار کرتے ہیں۔

اس کے بعد اب ان گمراہ۔ حق سے منحرف۔ ظالموں اور جابروں کی روحوں کا ایک منظر پیش کر دینا بھی ممکن ہو جاتا ہے جو عالم برزخ میں غمگین اور تکلیف دہ حالات میں گزاریں گی۔ جو اپنے ماضی کے بداعمالیوں اور گناہوں پر شرمسار بھی ہوں گی اور عذاب الٰہی میں مبتلا رہیں گی۔ عالم برزخ کی سزاؤں سے گنہگاروں کو نہ تو نجات ہی مل سکے گی اور نہ اس جگہ ان کا کوئی سفارشی ہوگا۔ وہاں پر تو بس قانون قدرت پر ہی عمل ہوگا۔ وہاں قانون قدرت نافذ ہوگا۔ اور حکم کے بجالانے والے ایسے زبردست اور حکم کے پابند ملائکہ ہوں گے جن کے لئے خود قرآن میں آیا ہے کہ وہ ہمارا حکم بجالانے میں ذرہ بھر بھی کوتاہی نہیں کرتے۔ ان سے بھی بُری حالت ہوگی ان ظالموں اور

جبّاروں کی جن کے ہاتھ مظلومین۔ اور معصومین کے خون سے رنگین ہوں گے اور جن کے خنجر اہل حق کے سینوں میں پیوست ہوئے ہوں گے۔ مظلومین اور اہل حق پر کئے گئے یہ مظالم آخیر وقت میں ان پر انتہائی وحشت ناک طریقہ سے حملہ آور ہوں گے اور پھر انھیں برزخ کے آتشکدوں میں ڈھکیل دیا جائے گا۔ جس کی منظر کشی قرآن حکیم نے اس طرح کی ہے۔

"اور اب تو (برزخ) کی دوزخی آگ ہے کہ وہ (ہر) صبح و شام اس کے سامنے لاکھڑے کئے جاتے ہیں اور جس دن قیامت برپا ہوگی (حکم ہوگا کہ) فرعون کے لوگوں کو سخت سے سخت عذاب میں جھونک دو۔" (۴۰۔۴۶) یا "وہ لوگ وہاں سلام کے سوا کوئی بیہودہ بات نہیں سنیں گے (ہر طرف سے) سلام ہی سلام کی آوازیں آئیں گی۔ اور وہاں پر ان کا کھانا صبح و شام ان کے لئے تیار ہوگا۔" (۱۹۔۶۲)

ان آیات میں برزخی جہنم اور برزخی جنّت کا ہی ذکر ہے۔ ساتھ ہی یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ برزخ اسی زمین پر ہے جہاں تا قیامت صبح بھی ہے اور شام بھی ہے۔ یا پھر۔

"جو لوگ بدبخت ہیں وہ دوزخ میں ہوں گے اور اسی میں ان کی ہائے وائے چیخ و پکار ہوگی اور وہ لوگ جب تک آسمان و زمین ہیں ہمیشہ اسی میں رہیں گے۔" (۱۱۔۱۰۷)۔ یا

"اور جو لوگ نیک بخت ہیں۔ وہ بہشت میں ہوں گے۔ جب تک آسمان و زمین باقی ہیں وہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے۔" (۱۱۔۱۰۸)

ان آیات سے یہ بات مزید ثابت ہو جاتی ہے کہ برزخ کا وجود اسی دنیا میں

ہے۔ جہاں زمین بھی ہے اور آسمان بھی ہے کیونکہ قیامت آجانے کے بعد نہ تو یہ زمین رہے گی اور نہ یہ آسمان ہوں گے جن کا وجود ہی سورج کی کارفرمائیوں کا نتیجہ ہے۔ جو بروز قیامت اپنی سرگرمیاں کھو دے گا اور پھر یہ نظام شمسی درہم برہم ہو کر رہ جائے گا۔ روایات معصومین اور ان سے متعلق واقعات بھی اس بات کی واضح دلیل ہیں کہ برزخ کی جنت اور دوزخ اسی دنیا میں موجود ہیں جہاں مرنے کے بعد تاقیامت رہنا ہو گا۔ مگر انھیں صرف معصومین کی نگاہیں ہی دیکھ سکتی ہیں۔

حبہ عرفی کا بیان ہے کہ میں حضرت علیؑ کے ساتھ "وادی السلام" گیا۔ امامؑ ایک جگہ ٹھہر گئے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی سے باتیں کر رہے ہیں۔ میں بھی کافی دیر تک کھڑا رہا۔ یہاں تک کہ تھک کر بیٹھ گیا۔ بیٹھے بیٹھے بھی تھک گیا تو پھر کھڑا ہو گیا یہاں تک کہ تھک کر پھر بیٹھ گیا۔ جب بالکل تھک کر چور ہو گیا تو اپنی عبا لے کر امام کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا "مولا میں عبا بچھائے دیتا ہوں آپ تھوڑی دیر آرام فرمائیں۔ مجھے ڈر ہے کہ زیادہ کھڑے رہنے سے کوئی تکلیف پیدا نہ ہو جائے۔" امامؑ نے فرمایا "اے حبہ اس طرح کھڑے رہنے میں تکلیف نہ ہو گی کیونکہ میں مومنوں سے بڑی خوشگوار باتیں کر رہا ہوں۔" میں نے عرض کیا "کیا وہ لوگ بھی اسی طرح ہیں۔" آپ نے فرمایا "ہاں" "اگر تمہاری نگاہوں سے پردہ اٹھا دیا جائے تو تم دیکھو گے کہ ایک گروہ دوسرے گروہ سے باتیں کر رہا ہے۔" عرض کیا "یہ اجسام ہیں یا ارواح" فرمایا "ارواح۔ مومن کو دنیا کے کسی گوشہ میں موت آئے اس کی روح کو حکم ملتا ہے کہ وہ وادی السلام میں آئے۔" یہ وادی نجف اشرف (عراق) کے عظیم قبرستان وادی السلام کا نام ہے جو زمین پر بہشت کا ایک ٹکڑا ہے۔ مومنین کی روحیں دور و نزدیک سے

آگر یہیں اکٹھی رہتی اور جنت کے مزے لیتی ہیں۔

اسی طرح ظالمین۔ کفار مشرکین کی خبیث روحوں کا مسکن برزخی دوزخ میں ہو گا۔ ایسے گنہ گاروں کی روحوں کے رہنے کی جگہ صحرائے برہوت ہے جو یمن کے اندر ایک ہولناک وادی ہے۔ وہاں نہ گھاس اگتی ہے اور نہ کوئی پرندہ وہاں سے گزرتا ہے اور یہی بد اعمال روحوں کا مسکن ہے۔ اور اس جگہ انھیں رہنا ہے اور تاقیامت برزخی جہنم کی سزائیں "تاقیامت" بھگتنا ہے۔ اس سلسلے میں بھی ایک مستند روایت پیش کر دینا ضروری ہو گا۔

ایک روز ایک شخص رسول اسلامؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنی وحشت کا اظہار کرتے ہوئے عرض کرنے لگا کہ "یا رسول اللہ میں نے ایک عجیب چیز دیکھی ہے جس کی وضاحت حضور سے چاہتا ہوں۔"

آپ نے فرمایا "کیا دیکھا ہے" تو اس نے کہا کہ "میری زوجہ جلدی بیماری میں سخت علیل ہوئی۔ لوگوں نے بتلایا کہ وادی برہوت کے کنویں کا پانی لا کر اس کو نہلاؤ اور اس کے لئے استعمال کرو تو یہ صحت یاب ہو جائے گی۔ (بعض جلدی امراض معدنیاتی پانی سے دور ہو جاتے ہیں) چنانچہ میں تیار ہوا اور اپنے ساتھ ایک مشک اور ایک پیالہ لے لیا۔ وہاں پہنچا تو ایک وحشت ناک صحرا دیکھا۔ ہر طرف ہولناک صحرا تھا۔ میں بہت ڈرا مگر اس کنویں کو تلاش کر لیا۔ ابھی مشک کو بھر رہا تھا کہ ناگہاں اوپر سے زنجیر کی آواز سنائی دی جو نیچے کی طرف آ گئی۔ میں نے دیکھا کہ ایک شخص ہے جو زنجیروں میں بندھا ہوا اوپر سے نیچے کی طرف لٹک رہا ہے اور مجھ سے کہہ رہا ہے کہ مجھے پانی پلا دو ورنہ میں ہلاک ہو جاؤں گا۔ جب میں نے اپنا سر

بلند کیا کہ اسے پانی کا پیالہ دوں تو دیکھا کہ اُسے اوپر کھینچ لیا گیا یہاں تک کہ وہ آفتاب کے قریب پہنچ گیا۔ اور اس طرح تین مرتبہ ہوا تو میں نے مشک کا تسمہ باندھا اور اُسے پانی نہیں دیا۔ میں اس امر سے خوف زدہ ہو کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں"۔ حضرت رسولؐ نے فرمایا کہ "وہ بدبخت قابیل تھا (حضرت آدم کا بیٹا جس نے اپنے بھائی ہابیل کو قتل کیا تھا) اور وہ روزِ قیامت تک اسی مقام پر عذاب میں مبتلا رہے گا۔ یہاں تک کہ آخرت میں جہنم کے سخت ترین عذاب میں جھونک دیا جائے گا۔

"مگر اس کے نفس نے اس کو بھائی کے قتل کی ترغیب دی تو اس نے قتل کر دیا اور خسارہ اٹھانے والوں میں ہو گیا" (۵۔ ۳۰)

اگرچہ عالم برزخ کی نعمتیں اور نوازشیں یا عذاب و عقاب صرف روح کے لئے ہیں۔ لیکن روح کے علم۔ ایمان اور عمل کے مطابق اس کا جسد خاکی بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ اور اکثر قوتِ ایمانی اور اعمال عرفانی کے اثر سے۔ جسم بھی سیکڑوں اور ہزاروں سال بوسیدہ اور مٹی نہیں ہوتا اور تروتازہ بنا رہتا ہے۔ اور یہ حقیقت شہدائے احد کے سلسلے میں "حقائق القرآن" میں درج کی جا چکی ہے۔ اسی طرح بادشاہ فتح علی کے دور میں ابنِ بابویہ علیہ الرحمتہ کی لاش جن کو مرے ہوئے نو سال ہو چکے تھے اور جب ان کے قبر کے سرداب کی مرمت ہو رہی تھی تروتازہ پائی گئی یہاں تک کہ ان کے ناخنوں پر حنا کا رنگ بھی ظاہر تھا۔ اسی طرح "روضۃ الجنات" میں ہے کہ ۱۲۳۸ھ میں بارش کی وجہ سے جب شیخ صدوق رحمتہ کے مقبرے میں رخنہ پڑ گیا تھا اور سرداب کے مرمت کا کام چل رہا تھا تو آپ کا جسم مطہر قبر کے اندر بالکل صحیح و سالم پایا گیا اور اُنکے ناخنوں پر خضاب تک کا اثر

پایا گیا۔ اور ایران کے بادشاہ شاہ فتح علی خود علماء کی ایک جماعت کے ساتھ تحقیق کے لئے آئے اور اس واقعہ کو صحیح پایا۔ چنانچہ بادشاہ نے عمارت کی تجدید اور آئینہ بندی کرائی۔

قیامت کا پس منظر

"یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ السَّاعَةِ اَیَّانَ مُرْسٰھَا ○ فِیْمَ اَنْتَ مِنْ ذِکْرٰھَا ○
اِلٰی رَبِّکَ مُنْتَھٰھَا ○ اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرُ مَنْ یَّخْشٰھَا ○ (۷۹۔۴۲ تا ۴۵)

"(اے پیغمبر) لوگ تم سے قیامت کے بارے میں پوچھتے ہیں کہ وہ کب واقع ہوگی۔ تو تم اس کے ذکر سے کس فکر میں ہو۔ اس کے واقع ہونے کا وقت تمہارے پروردگار کو ہی معلوم ہے۔ جو شخص اس سے ڈرتا ہے تم اسی کو ڈرا سکتے ہو۔"

قیامت میں ہونے والے حادثات اور واقعات کا ذکر قرآن حکیم میں جگہ جگہ آیا ہے۔ جس کی جدید سائنس کی تحقیق اور دریافت سے کس قدر یکسانیت اور ہم آہنگی ہے اس کے ایک اجمالی تذکرہ میں اپنی کتاب "حقائق القرآن" کے آخری باب "آثار قیامت" میں بھی کر چکا ہوں۔ خالق کائنات کا کوئی بھی کام خالی از مصلحت نہیں ہوتا۔ یوں تو خدا جو خالق علم اور خالق عقل ہے اس کے مقاصد اور امور تک جہالت کی تاریکیوں میں سر مارنے والوں کی رسائی بھلا کب ممکن ہو سکتی ہے اور میں نے بھی اپنی بساط عقل اور خدا کی دی ہوئی توفیقات کے سہارے پر جو کچھ بھی اس سلسلے میں کاوش کی ہے وہ اسی کی دی ہوئی صلاحیتوں اور رہبری کے سہارے سے ممکن ہو سکی ہے۔ میں ایک بار پھر اپنی کوتاہ عقلی۔ کم مائیگی کا اعتراف کرتے ہوئے اپنے خدا سے رہبری کا طالب اور اپنی لغزشوں پر ایک جاہل اور نادار بندہ کی حیثیت سے معافی کا پُر یقین امیدوار ہوں۔

قرآن حکیم میں قیامت کے سلسلے میں صور کے دو بار پھونکے جانے کا ذکر کئی مقامات پر آیا ہے۔ کہیں کہیں اسی واقعہ کو ایک کے بعد دوسرے دھماکے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں ایک دھماکے یا نفخ صور کا ردعمل یا عملی اثر کیا ہوگا اس کو ذہن نشین کر لینے کے لئے خدا کی معجز نما کتاب کا سہارا لینا ہوگا۔ جس میں قیامت کی انتہائی واضح اور مُدلّل تفصیلات ملتی ہیں اور بہت سے رموز اور اشارات کی عقدہ کشائی ہو جاتی ہے۔

قیامت کے پس منظر کو ذہن نشین کرنے کے لئے سب سے پہلے اس وقفہ کا تعین کر لینا ضروری ہے جو ان دو دھماکوں (نفخ صور) کے درمیان حائل ہوگا۔ اس سلسلے میں قرآن حکیم میں ارشاد ہو رہا ہے کہ۔

"(اے رسُول) لوگ تم سے عذاب کے بارے میں جلدی کرتے ہیں۔ حالانکہ اللہ کبھی وعدہ کے خلاف نہیں کرے گا۔ اور تمہارے پروردگار کے نزدیک ایک دن تمہاری گنتی سے ہزار برس کے برابر ہوگا۔" (۲۲۔۴۷)۔ اور اس طرح روز قیامت ان دو نفخ صور کے درمیانی مدت میں واقع ہونے والے حادثات۔ امور اور واقعات کے پیش نظر اگر اس کی انتہائی مدت ایک گھنٹہ بھی مان لی جائے تو یہ وقفہ بھی آیت بالا کی رہبری میں اکتالیس سال۔ چھ مہینہ کے قریب ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں تفصیلی مطالعہ سے ہونے والے واقعات اور ان پر غور و خوض کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ پہلے نفخ صور کے بعد رونما ہونے والے واقعات کے پیش نظر اسے "یوم غضب" یا "روز قیامت" اور دوسرے نفخ صور کے بعد ہونے والے واقعات کے پیش نظر اسے "یوم محشر" یا "روز جزا" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ "کلام اللہ" مترجم مولانا فرمان علی صاحب

کے ص۴۳۷ پر ایک روایت میں قتادہ سے منقول ہے کہ دونوں نفخ صور کے درمیان کا وقفہ چالیس برسوں کا ہوگا۔

قرآن حکیم میں ان دو نفخوں کا بہت واضح اور تفصیلی ذکر ملتا ہے۔ اور ان کے بعد پیش آنے والے حادثات اور واقعات کو بھی بڑی وضاحت کے ساتھ کئی جگہ دُھرایا گیا ہے۔

"یہ لوگ ایک چنگھاڑ (صور) کے منتظر ہیں جو انھیں اس وقت لے ڈالے گی جب یہ لوگ آپس میں جھگڑ رہے ہوں گے۔ پھر نہ تو یہ لوگ نصیحت کر پائیں گے اور نہ اپنے لڑکے بالوں کی طرف لوٹ کر جا سکے گے۔ اور پھر (جب دوبارہ) صور پھونکا جائے گا تو اسی دم یہ لوگ (اپنی اپنی) قبروں سے (نکل نکل کر) اپنے پروردگار کی طرف چل کھڑے ہوں گے اور حیران ہو کر کہیں گے کہ ہائے افسوس ہم تو پہلے سو رہے تھے۔ ہم کو ہماری قبروں سے کس نے جگا اٹھایا۔ جواب آئے گا کہ یہی تو (روز محشر ہے) جس دن کا خدا نے بھی وعدہ کیا تھا اور پیغمبروں نے بھی سچ کہا تھا۔ یہ تو ایک چنگھاڑ ہوگی پھر یکایک سب کے سب ہمارے حضور میں حاضر کئے جائیں گے۔ پھر آج (روز محشر) کسی پر کچھ بھی ظلم نہ ہوگا اور تم سب کو اسی کا بدلہ ملے گا جو تم دنیا میں کیا کرتے تھے" (۳۶ ۔ ۴۹ تا ۵۴)۔

"اور جب (پہلی بار) صور پھونکا جائے گا تو جو لوگ آسمانوں میں ہیں اور جو لوگ زمین پر ہیں (موت سے) بیہوش ہو کر گر پڑیں گے۔ مگر ہاں جس کو خدا چاہے (البتہ وہ بچ جائے گا) پھر جب (دوبارہ) صور پھونکا جائے گا تو فوراً سب کھڑے ہو کر دیکھنے لگیں گے" (۳۹ ۔ ۶۸)۔

جس دن (نفخ صور کی) ایک دہلا دینے والی آواز آئے گی۔ اس کے بعد (اسی کی) ایک دوسری آواز آئے گی۔ دل اُس دن سخت خوفزدہ ہوں گے۔ آنکھیں ندامت سے جھکی ہوئی ہوں گی۔ (۷۹ ۔ ۶ تا ۹)۔

ان آیات میں اس بات وضاحت ہو جاتی ہے کہ پہلے نفخ سور کے بعد قیامت کا ایک ایسا ہولناک منظر ہوگا جب زلزلوں۔ دھماکوں اور تخریبی ہنگاموں سے دل لرز اٹھینگے اور انجام کار ساری خلقت موت کے آغوش میں سو جائے گی۔ اس کے بعد دوسرے نفخ صور کی آواز کے بعد لوگ دوبارہ زندہ ہو کر مضمحل اور سراسیمہ حال میدانِ حشر کی طرف ندامت اور شرمندگی کی حالت میں سر جھکائے ہوئے اپنے خالق کی طرف چل پڑیں گے۔ اس دن ان کو خوف کے بجائے دنیا میں کی گئی بداعمالیوں کے لئے تاسف ہوگا۔ روز جزاء کو جھٹلانے کے لئے ندامت ہوگی اور شرمندگی سے ان کے سر جھکے ہوئے ہوں گے۔ اور اُن کی آنکھیں اُوپر نہ اُٹھ سکیں گی۔ اب رہا یہ سوال کہ پہلے نفخ صور کے بعد وہ کون سی ایسی مخلوق اور ہستیاں ہوں گی جو زندہ بچی رہیں گی اسے تو خالق مطلق ہی بہتر جانتا ہے جس کی مخلوق کا صحیح علم تو انسان کے ناقص ذہن کو نہیں ہو سکتا۔ اور نہ شاید کبھی ہو سکے گا۔ ممکن ہے اس سے وہ ملائکہ مقربین مُراد ہوں جنہیں اس درمیانی وقفہ میں بھی نظام عالم، گردش کائنات۔ میدان حشر اور قیامت آجانے کے بعد دوسرے امور انجام دینے ہوں گے۔ جیسے جناب اسرافیل جنہیں دوسرے نفخ صور تک کے لئے بہر حال زندہ رہنا ہی ہوگا یا جناب عزرائیل جن کا کام بھی ادھورا ہی ہوگا اور پھر یہ قیامت بھی تو اس کائنات کے ایک ننھے سے حصے اور اس نظام شمسی تک کے لئے ہی محدود ہوگی اور باقی اس کائنات کے

کام تو حسب دستور چلتے ہی رہیں گے۔ قرآن حکیم نے ایک جگہ اس حقیقت سے بھی آگاہ کیا ہے۔ "ان کی قسم جو آسمان و زمین کے درمیان پیرتے پھرتے ہیں پھر ایک کے آگے بڑھتے ہیں پھر (کائنات کا) انتظام کرتے ہیں" (۷۹۔ ۳ تا ۵)

واللہ اعلم بالصواب۔

قرآن حکیم میں دونوں نفخ صور کی وضاحت کرنے کے ساتھ ساتھ ہر نفخ صور کے بعد پیش آنے والے حادثات اور رونما ہونے والے واقعات کا ذکر بھی قرآن حکیم میں آیا ہے۔ جو کچھ اس طرح سے ہے۔

ذکر پہلے نفخ صور کا

:۔ قرآن حکیم نے پہلے نفخ صور کے تحت پیش آنے والے واقعات کا ذکر اس طرح کیا ہے۔ "پھر جب صور میں (پہلی بار) پھونک ماری جائے گی اور زمین اور پہاڑ اٹھا کر ایکبارگی (ٹکرا کر) ریزہ ریزہ کر دئے جائیں گے تو اس روز قیامت آ ہی جائے گی۔ اور آسمان پھٹ جائے گا۔ اور وہ اس دن بہت پھس پھسا ہوگا۔" (۶۹۔ ۱۳ تا ۱۶)

"جب سورج کی روشنی لپیٹ دی جائے۔ اور جب تاروں کی روشنی جاتی رہے گی۔ اور جب پہاڑ چلائے جائیں گے۔ (۸۱۔ ۱ تا ۳)

جس دن آسمان پگھلے ہوئے تانبے جیسا ہو جائے گا اور پہاڑ دھنکی ہوئی روئی جیسے ہوں گے۔" (۷۰۔ ۸ تا ۹)

"جب تاروں کی چمک جاتی رہے گی۔ جب آسمان پھٹ جائے گا اور جب پہاڑ (روئی کی طرح) اُڑے اُڑے پھریں گے۔" (۷۷۔ ۸ تا ۱۰)

قیامت کے سلسلے میں اس طرح کی آیات کی رہبری میں قیامت کے پیش آنے والے سانحات کی تفصیلات اور ان کے علمی اور سائنسی جواز "حقائق القرآن" میں آثار قیامت کے تحت پیش کئے جا چکے ہیں جس میں زلزلوں اور بھونچالوں کے آنے۔ سیاروں کے ایک دوسرے سے ٹکرانے۔ پہاڑوں کے ریزہ ریزہ ہو جانے اور روئی کی طرح اُڑتے پھرنے۔ آسمان کے پگھلے ہوئے تانبے کی شکل ہو جانے اور پھر لال نری کی طرح سُرخ ہو جانے۔ سمندروں اور دریاؤں میں آگ لگ کر خشک ہو جانے کے علمی اور سائنسی جواز دلائل کے ساتھ پیش کئے جا چکے ہیں جو انتہائی واضح اور قابل قبول ہیں۔

مشہور ماہر افلاکیات نکولاس کامیلے فلے ماریَن۔ NicolasCammille.Flammarion رقمطراز ہے کہ اس کرہ ارض کی حرکت وعمل اور اس کی بقا نظام شمسی کی قوت جاذبہ عائلہ اور قوت مرکزی کی وجہ سے ہی ہے کیونکہ یہی قوت جاذبہ تمام عالم کے ذرات سے لے کر ستاروں تک کو ایک دوسرے سے مربوط کئے ہوئے ہے۔ اس طرح یہ قوت مرکزیہ ہی ہے جو ان کی حرکتوں کو منظم کئے ہوئے ہے۔ لیکن آخر کار ایک دن اس نظام شمسی کو فنا ہونا ہی ہے اور ایک دن ایسا ضرور آئے گا۔ جب اس کی زندگی ختم ہو جائے گی اور اس کے نتیجے میں اس نظام شمسی کے تمام سیارے بھی فنا کے گھاٹ اتر جائیں گے اور ایک دن قیامت آجائے گی۔"

غور کرنے پر قرآن حکیم بھی ان سارے علمی اور سائنسی حقائق کا اشارہ فرماتا ہے۔

یہ ایک عالمی حقیقت ہے کہ یہ موجودہ نظام عالم آخر ایک دن عظیم حادثہ سے دوچار ہوگا اور اس جہان میں انسانی کاوشیں تحقیق اور دریافتیں جو تکمیل کی

طرف تیزی سے رواں ہیں اور انسان ایک کے بعد دوسری تسخیر کی فکر میں لگے ہوئے ہیں ان کی یہ کاوشیں اور کامیابیاں ایک دن ختم ہو جائیں گی۔ ایک دن سورج اپنی مرکزی کشش ثقل کھو دے گا۔ پھر اس نظام شمسی کے تمام سیارے بھی اپنی کشش ثقل کھو کر بے قابو ہو جائیں گے۔ ایک دوسرے سے ٹکرائیں گے۔ عظیم دھماکے ہوں گے اور پھر یہ دنیا روز قیامت تتر بتر ہو کر فنا کے آغوش میں چلی جائے گی۔ قیامت کی بنیادی وجہ تو یہی نظر آتی ہے کہ ایک دن سورج کا ایندھن ختم ہو جائے گا۔ پھر وہ سرخ ہو کر "سرخ افریت" ہو جائے گا اس کی کشش ثقل ختم ہو جائے گی اس کی اندرونی اور بیرونی میکانیکی گردش معدوم ہو جائے گی۔ اس کے بعد ہر طرف ابتری اور زلزلوں کا ہنگام ہوگا۔ پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح سے پھُس پھُسے ہو کر اڑتے پھریں گے۔ پانی کے مرکبات آکسیجن اور ہائڈروجن اپنی واحد اور ذاتی خصوصیات کی طرف لوٹیں گے جس کے نتیجہ میں سمندر میں آگ لگ جائے گی۔ جس کے نتیجے میں سارے دریا خشک ہو جائیں گے۔ سورج کے سرخ ہو جانے کی وجہ سے آسمان پگھلے ہوئے تانبے کی شکل کا اور لال نری کی طرح سرخ ہو جائے گا۔ ان کی تفصیلات اور ان کے سائنسی جواز "حقائق القرآن" میں پیش کئے جا چکے ہیں۔ اور پھر زمین اپنے خالق کے حکم سے اپنے اندر مدفون ساری لاشیں۔ ہڈیاں اور پنجر یہاں تک کہ اپنے اندر چھپے ہوئے سارے دفینے باہر نکال دے گی۔

خداوند کریم نے اس بات کی آگاہی بھی قرآن حکیم میں جگہ جگہ دے دی ہے کہ یہ نظام کائنات محض ایک معینہ مدت تک کے لئے ہی ہے جسے نہ دوام ہے اور نہ

ہمیشگی۔ کیا ان لوگوں نے اپنے دل میں "اتنا بھی غور نہیں کیا کہ خدا نے آسمان اور ان کے درمیان ہر چیز کو ٹھیک اور مقررہ مدت کے لئے ہی پیدا کیا ہے اور لوگ تو اپنے پروردگار کے بارگاہ کی حضور کو ہی نہیں مانتے" (۳۰۔۸)

"ہم نے تو سارے آسمان و زمین اور جو ان دونوں کے درمیان ہے حکمت ہی سے ایک خاص وقت کے لئے پیدا کیا ہے"۔ (۴۶۔۳)

اس کے بعد اس سلسلے کی ایک انتہائی اہم عالمانہ اور حکیمانہ آیت کا پیش کرنا بھی ضروری ہو جاتا ہے۔ جس میں مدفون اجساد انسانی ان کی کرم خوردہ اور کھائی ہوئی ہڈیوں اور پنجروں کا تذکرہ ہے۔ کہ کس طرح ان عظیم زلزلوں اور بھونچالوں کے نتیجے میں یہ سارے انسانی پنجر اور ہڈیاں زمین کے پھٹنے اور تہہ و بالا ہونے کے نتیجے میں باہر نکل آئیں گی اور پھر ہر طرف ہڈیوں کے ڈھانچے ہی ڈھانچے نظر آئیں گے اور اس طرح زمین زیر فرمان الٰہی اپنے سارے دفینے نکال کر باہر ڈال دے گی۔

"زمین (جب) بڑے زوروں کے ساتھ زلزلے میں آجائے گی اور اپنے اندر کے سارے بوجھ (مردے اور معدنیات وغیرہ) نکال ڈالے گی"۔ (۹۹۔۱تا۲)۔

"جب قبریں اکھاڑ دی جائیں گی"۔ (۸۲۔۴)۔

"پھر وہ قبروں سے اس طرح نکلینگے گویا پھیلی ہوئی منتشر ہڈیاں ہیں (ہر طرف بکھرے پڑے ہونے کا منظر)" (۵۴۔۷)۔

"جب آسمان پھٹ جائے گا اور اپنے پروردگار کا حکم سن لے گا۔ اور ہونا بھی یونہی چاہئے۔ اور جب زمین تان دی جائے گی اور جو کچھ اس میں ہے (انسانی

پنجر اور دفینے) باہر نکال کر خالی ہو جائے گی۔ اور اپنے مالک کا حکم سن لے گی اور ہونا بھی یونہی چاہیئے (تب قیامت آجائے گی" (۸۴۔ ۱ تا ۵)

قرآن حکیم نے جگہ جگہ قیامت کی ہنگامہ خیزیوں کا ذکر کچھ اس انداز سے کیا ہے کہ پہلے نفخ صور کے بعد کے سارے سانحات نگاہوں کے سامنے پھرنے لگتے ہیں۔

"کھڑکھڑانے والا (واقعہ) کیا ہے۔ وہ کھڑکھڑانے والا (واقعہ) اور تم کیا سمجھتے ہو وہ کھڑکھڑانے والا واقعہ کیا ہے۔ (وہ ایسا) دن ہے جس دن آدمی ایسے ہو جائیں گے جیسے بکھرے ہوئے پتنگے (مُردہ انسان۔ اپنی اپنی قبروں سے نکل کر باہر اس طرح پڑے ہوں گے جیسے بے جان اور مردہ پتنگے)۔ پہاڑ ایسے ہو جائیں گے جیسے دھنکی ہوئی اون (مختلف رنگ کے پہاڑوں کا ٹکرا ٹکرا اور چکنا چور ہو کر مختلف رنگوں کے اون کی طرح پھُس پھُسے ہو کر (ہر طرف) پھیل جائیں گے"۔ (۱۰۱۔ ۱ تا ۴)۔

پہلے نفخ صور کے بعد سورج اور پھر سارے سیارے اپنی روشنی کھو دیں گے اور سورج کے معطّل ہو جانے کے نتیجے میں اس نظام شمسی کے تمام سیارے اپنی کشش ثقل مرکزی اور کشش ثقل باہمی کھو دیں گے اور وہ سب بے قابو ہو کر ایک دوسرے سے ٹکرائیں گے۔ یہ ٹکریں اس قدر زبردست ہوں گی کہ پہاڑ ریزہ ریزہ ہو کر دھنکے ہوئے رنگین اور سفید روئی کی طرح سے پھُس پھُسے ہو کر ہر طرف بکھر جائیں گے اور پھر اس ہولناک صدمہ اور حادثہ کے نتیجے میں ساری خلقت موت کے آغوش میں چلی جائے گی۔ زمین کو عظیم زلزلے اور جھٹکے آئیں گے اور وہ اس طرح جھنجھوڑ دی

جائے گی کہ اس کے اندر کے سارے مُردے۔ ہڈیاں۔ پنجر۔ دفینے اور معدنیات باہر نکل کر بکھر جائیں گے۔ اس میں کوئی بھی ایسی چیز نہیں رہ جائے گی جس کا تعلق سطح زمین یا اعضاء جسمانی سے ہو۔

اس افراتفری زلزلوں اور ہنگاموں میں جب کہ اس نظام شمسی کے دوسرے سیارے بھی بے قابو ہو کر زمین سے ٹکرا رہے ہوں گے۔ پہاڑ روئی کے گالوں اور دھنکی ہوئی اون کی طرح سے منتشر ہو رہے ہوں گے لیکن ان سب ہنگامہ خیزیوں اور انتشار میں بھی جب کہ ہر چیز بے ترتیب نظر آرہی ہوگی ایک فطری ترتیب ہوگی۔ اس بدنظمی میں بھی ایک قوی اور حکیمانہ نظام ہوگا۔ اس ظاہری بے ربطگی میں بھی ایک منظم ربط ہوگا۔ اور قیامت کی ساری قیامت خیزیاں تابعہ فرمان الٰہی ہوں گی۔ ہر عمل اس کی مرضی کے مطابق اور ہر فعل اس کے مقصد کے عین مطابق ہوگا۔ اور اس طرح اس روز کے انہدام اور افراتفری پر بھی خالق جبار و قہار کا مکمل تسلط اور غلبہ ہوگا۔ جس کا ذکر قرآن حکیم میں انتہائی مدبرانہ انداز میں آیا ہے۔ "(وہ ایسا قادر ہے) کہ قیامت کے دن ساری زمین (گویا) اس کی مٹھی میں ہوگی اور سارے آسمان (گویا) اس کے داہنے ہاتھ میں لپٹے ہوئے ہوں گے"۔ (۲۹۔ ۶۷)

پہلے اور دوسرے نفخ صور کا درمیانی وقفہ

:۔ پہلے نفخ صور کے تحت عمل میں آنے والے سارے اعمال قیامت کے اختتام کو پہنچ جانے کے بعد قادر مطلق کے ارشاد کے مطابق زمین بلکل ہموار کر دی جائے گی۔ پھر نہ اس میں کوئی پستی نظر آئے گی اور نہ بلندی اور نہ کہیں پر کوئی رخنہ "(اور اے رسولؐ) تم سے یہ لوگ پہاڑوں

کے بارے میں پوچھتے ہیں (کہ قیامت کے دن کیا ہوں گے)۔ تو کہہ دو کہ میرا پروردگار انھیں ریزہ ریزہ کر کے اڑا ڈالے گا۔ اور پھر زمین ایک چٹیل میدان کر چھوڑے گا۔ نہ تو اس میں کوئی موڑ دیکھے گا۔ نہ اونچ نیچ" (۲۰: ۱۱۰ تا ۱۱۲)۔

اور پھر مسطح اور ہموار زمین پر ہر طرف اس وقت انسانی لاشیں۔ قبروں سے اکھاڑ پھینکی ہوئی مُردوں کی ہڈیاں اور ڈھانچے اور سارے دفینے بکھرے ہوں گے۔ ایک مدت دراز مگر مدت معینہ تک کے لئے جو قرآن حکیم کے مطابق تو ایک دن کا ہی ہوگا مگر عالم بالا کا وہ ایک دن ہمارے ایک ہزار سال کے برابر ہوگا۔ مولانا فرمان علی قبلہ کے قرآن مترجم ص۳۴۷ میں منقول ہے کہ یہ عرصہ چالیس برس کا ہوگا اور مفسر و مترجم مولانا سیّد مقبول احمد قبلہ کے تفسیری قرآن مجید جلد ۲ ص۳۴۷ کے مطابق "تفسیر قمی" میں ہے کہ حضرت زین العابدینؑ سے دریافت کئے جانے پر کہ مولا ان دونوں نفخوں کے درمیان کتنا وقفہ ہوگا تو آپ نے فرمایا "کہ جتنا اللہ چاہے"۔ عرض کی گئی کہ فرزند رسولؐ یہ تو بتلا دیجئے کہ صور پھونکا کیونکر جائے گا تو آپ نے فرمایا کہ "پہلی مرتبہ صور پھونکے جانے کی صورت یہ ہے کہ خدا (اسرافیل) کو حکم دے گا کہ وہ صور لے کر دنیا میں اتریں۔ اس صور کا سِرا تو ایک ہوگا مگر اس کے رُخ دو ہوں گے اور دونوں رخوں کے مابین اتنا فاصلہ ہوگا جتنا آسمان اور زمین کا۔ جس وقت فرشتے دیکھیں گے کہ اسرافیل صور لئے ہوئے دنیا میں اتر آئے تو وہ کہیں گے کہ اب زمین والوں اور آسمان والوں (نظام شمسی کے سارے سیاروں) کی موت آگئی۔ پس اسرافیل بیت المقدس کے خطیرہ میں اتریں گے اور کعبہ کی طرف رُخ کر کے استادہ ہوں گے۔ جب زمین پر رہنے والے انھیں دیکھیں گے تو وہ کہیں گے

کہ خداوند تعالیٰ نے زمین پر رہنے والوں کی موت کا حکم دے دیا"۔

نفخ صور پہلا ہو یا دوسرا اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ سورج کا بے نور ہو کر سُرخ ہو جانا اور پھر اپنے سے ڈھائی سو گنا بڑا ہو کر سرخ افریت Redgiant ہو جانا دریاؤں میں آگ لگ جانا اور اس کے بعد خشک ہو جانا۔ سیاروں کا اپنی کشش کھو دینا۔ اور پھر ان کا بے قابو ہو کر ایک دوسرے سے اور زمین سے ٹکرانا۔ یہ قیامت کا ہنگامہ۔ پہاڑوں کا ریزہ ریزہ ہو جانا۔ زمین پر عظیم زلزلوں کا آنا اور ان کے جھٹکوں کے نتیجے میں مردوں۔ ہڈیوں اور ڈھانچوں کا باہر آجا یہ سب نفخ صور کا ردعمل یا اس کی وجہ سے ہوگا۔ بلکہ ان سب تخریبات کے علمی اور سائنسی وجوہات ہوں گے جو فرداً فرداً حقائق القرآن میں واضح کئے جا چکے ہیں۔ غور کرنے پر ایک ہی صور کے دوبار بجنے کے دو مختلف اور متزاد اثرات نظر آتے ہیں پہلے صور کے بعد قیامت کی ہنگامہ خیزیاں۔ موت کے طوفانی جھکڑ اور ہر طرف تخریب کاریاں نظر آتی ہیں تو دوسرے صور کی آواز کے بعد تعمیر نو۔ زندگی۔ میدان حشر کا اژدھام۔ نور اور قدرت کی کارفرئیاں۔

غور کرنے پر نفخ صور کا مقصد عیاں ہو جاتا ہے کہ جس طرح کسی خصوصی پروگرام اور ارادی کام کا آغاز بگل کی آواز کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ یا جس طرح کسی خصوصی تقریب یا کھیل کی ابتدا دھماکے یا قرنا کی آواز کے ساتھ کی جاتی ہے یا ابتدا کرنے کے لئے سیٹی بجائی جاتی ہے اسی طرح صور کی پہلی آواز سے آغاز قیامت اور صور کی دوسری آواز سے آغاز حشر و نشر کا اعلان ہوگا جیسے حضرت اسرافیل بجا کر کریں گے اور اس طرح پہلا نفخ صور قیامت اور ہلاکت کی ابتدا کے لئے اور اس کے بعد دوسرا

صور آغاز محشر کے لئے خدا کی مرضی اور منشاء کے مطابق پھونکا جائے گا۔

قرآن حکیم کا ارشاد ہے کہ زمین پر قائم سارے پہاڑ چکنا چور ہو کر ریت اور دھنکی ہوئی روئی اور رنگین اون کی طرح منتشر ہو کر زمین پر پھیل جائیں گے۔ دریائیں خشک ہو جائیں گی۔ زمین پر نہ کہیں رخنہ ہوگا اور نہ کہیں کسی طرح کی بلندی اور پستی ہوگی۔ وہ ہر طرف مسلح اور ہموار ہو جائے گی۔ ہر طرف دفینوں کے ڈھیر لگے ہوں گے انسانی ڈھانچوں اور ہڈیوں کا نظارہ ہوگا۔ اور یہ موت اور سناٹے کا عالم ایک مدت معینہ تک قائم رہے گا۔ اس وقت نہ کوئی زندہ ہوگا اور نہ کہیں زندگی کے آثار ہوں گے۔ ساری دنیا پر خالق کائنات کی حکومت ہوگی۔ اس کی عظمت اور جلالت ہوگی اور پھر "لمن الملک الیوم" کی ایک لرزا دینے والی آواز گونج اٹھیگی۔ جواب دینے والا کوئی نہ ہوگا۔ اور پھر ایک مدّت معینہ کے بعد لسان قدرت خود ہی جواب دے گی۔ "للہ واحد القہار ... میں نے ہی انھیں مقہور کیا۔ میں نے ہی ان کو موت دی۔ میں نے ہی اپنی قدرت سے انھیں پیدا کیا۔ میں نے ہی اپنی مشیت سے انھیں موت دی۔ اور اب میں اپنی قدرت کاملہ سے ان کو دوبارہ زندہ کرتا ہوں!

اور اس کے بعد خدا کے حکم سے دوسرا صور پھونکا جائے گا ...!!

قرآن حکیم میں کئی جگہ آیا ہے کہ مرنے کے بعد تم دوبارہ ضرور اٹھائے جاؤ گے۔ یہ ہمارا وعدہ اور پختہ ارادہ ہے جس میں کوئی شک نہیں ہے۔ قیامت اور حشر نشر پر ایمان رکھنا ہر مومن کا فرض ہے۔

"اسی نے تم کو پیدا کیا۔ پھر وہی تم کو موت دے گا۔ پھر وہی تم کو دوبارہ زندہ کرے گا۔" (۲-۲۸)۔

جب ہم آسمان کو اس طرح سمیٹ دیں گے جس طرح خطوط کا طومار لپیٹا جاتا ہے۔ جس طرح ہم نے مخلوق کو پہلی بار پیدا کیا تھا اسی طرح دوبارہ پیدا کریں گے یہ (وعدہ) ہے۔ جس کا کرنا ہم پر لازم ہے" (۲۱-۱۰۴ تا ۱۰۴)

اس دنیا سے متعلق ایک انتہائی اہم حقیقت کا انکشاف قرآن حکیم کی آیات اور احادیث سے ہو جاتا کہ یہ دنیا لاکھوں اور کروڑوں سال پرانی ہے اور اس دنیا میں ہمارے بابا آدم سے پہلے بھی بہت سارے آدم اور ان کی نسلیں آباد ہوتی آئی ہیں اور یہ ہمارے بابا آدم اور ان کی نسل اس سلسلے کی آخری کڑی ہیں۔ پھر اس کے بعد یہ دنیا دوبارہ آباد ہونے کے لائق ہی نہیں رہ جائے گی کیونکہ ہر تخلیق اور تعمیر کی ایک عمر طبیعی ہوا کرتی ہے۔ جس کی وضاحت قرآن حکیم نے بھی کر دی ہے۔

"کیا ان لوگوں نے اس پر غور نہیں کیا کہ خدا کس طرح مخلوقات کو پہلے پہل پیدا کرتا ہے۔ پھر اس کو دوبارہ پیدا کرے گا۔ یہ تو خدا کے نزدیک بہت آسان ہے (اے رسوؐل ان لوگوں سے کہہ دیجئے) کہ روئے زمین پر چل پھر کر دیکھو کہ خدا نے کس طرح پہلے پہل مخلوق کو پیدا کیا۔ (پھر اسی طرح) خدا (روز محشر) آخری پیدائش پیدا کرے گا۔"

(۲۹-۱۸ تا ۳۰)

اس کے بعد انسان کے دوبارہ زندہ ہو اُٹھنے پر غور و فکر کرنے کے لئے جدید علوم و سائنس کے لئے بھی راہیں روشن ہو جاتی ہیں کہ خدا بوسیدہ ہڈیوں کو دوبارہ کیونکر اکٹھا کرے گا اور ان خاکستر ہڈیوں میں جان کیونکر ڈالے گا۔ جس کی طرف قرآن حکیم نے انتہائی واضح انداز میں رہبری کی ہے۔

"میں روز قیامت کی قسم کھاتا ہوں (تم دوبارہ) زندہ ضرور کئے جاؤ گے۔

ہم اس پر قادر ہیں کہ بوسیدہ ہڈیوں کو دوبارہ جمع کر دیں۔" (۷۵۔ ۳ تا ۴)

انسان کے دوبارہ زندہ کئے جانے کے سلسلے میں قرآن حکیم کی بہت سی آیات انتہائی اہم اور قابل غور ہیں۔ اس کی بہت سی پُر از حکمت آیات میں جن جن مقامات پرانسان کے دوبارہ زندہ کرنے کا ذکر ہے ہر جگہ بارش کے پانی۔ مُردہ اور بنجر زمینوں میں دبی ہوئی سوکھی خشک بیجوں کے جی اٹھنے کا تذکرہ خصوصیت کے ساتھ اور تمثیلاً آیا ہے۔ اور آب باراں کے ذریعہ سے بنجر اور مُردہ زمینوں میں پڑی ہوئی دبی دبائی خشک اور حقیر بیجوں سے پودوں۔ درختوں اور سبزہ زاروں کے اُگنے اور مُردہ زمینوں کے دوبارہ زندہ اور ہرے بھرے ہو اٹھنے کا مثالی تذکرہ بھی آیا ہے۔ جس سے اس بات کی وضاحت آسانی سے ہو جاتی ہے کہ جس طرح پودوں درختوں اور سبزہ زاروں کا اگنا بارش کے کیمیاوی ردعمل کا نتیجہ ہوتا ہے اور جس طرح بارش کا پانی عرصہ دراز سے زمینوں میں دبی ہوئی خوابیدہ اور مُردہ بیجوں تک پہنچ کر ان میں قوت نمو پیدا کر دیتا ہے اور کسی کیمیاوی ردعمل کے تحت وہ پھر سے زندہ ہو اٹھتی ہیں۔ اسی طرح ایک مخصوص کیمیاوی اثر رکھنے والے پانی کی بارش سے انسان کے اندر چھپی ہوئی "تخم لازوال" سے انسان بھی دوبارہ زندہ ہو اٹھینگے۔

"یہاں تک کہ جب ہوائیں (پانی سے بھری ہوئی) بوجھل بدلیوں کو لے اڑیں۔ تو ہم انھیں کسی شہر کی طرف (جو گویا مر چکا تھا) ہنکایا۔ پھر ہم نے اس پانی سے ہر طرح کے پھل زمین سے نکالے۔ ہم (روز محشر) اسی طرح زمین سے مُردوں کو باہر نکال لیں گے۔ تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔" (۷۔ ۵۷ تا ۵۸)

"ہم بادلوں کو شہر کی طرف ہنکال دیتے ہیں۔ پھر ہم اس کے ذریعہ سے زمین کو اسکے

مردہ ہونے کے بعد پھر سے (دوبارہ) زندہ کر دیتے ہیں۔ (اسی طرح) مردوں کو روز محشر جلا اٹھانا ہوگا۔" (۳۵۔ ۹)۔

"جس طرح خدا نے (مردہ) زمین کو زندہ کیا۔ یقیناً وہ مردوں کو روز محشر جلا اٹھائے گا۔" (۴۱۔ ۳۹)۔

جدید علم سائنس نے اپنی تحقیق اور دریافت سے بھی جو نتیجے حاصل کئے ہیں اور ہمارے آئمۂ طاہرین نے جو بھی فرمایا ہے وہ قرآن حکیم کے ارشادات کے عین مطابق ہے۔ جس کا ایک اجمالی جائزہ اس سلسلے کی اہم کڑی ہے۔

"المجالس اور تفسیر قمی میں امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے کہ جب خداوند تعالیٰ کو منظور ہوگا کہ اپنی مخلوق کو مبعوث فرمائے تو چالیس دن تک متواتر آسمان سے زمین پر پانی برسائے گا۔ جس کے ذریعہ سے بکھری ہوئی ہڈیوں کے جوڑ باہم مل جائیں گے اور گوشت اُگ آئے گا۔" اسی طرح امام حسن عسکریؑ نے فرمایا کہ "صور دو مرتبہ پھونکا جائے گا۔ پہلی مرتبہ صور پھونکے جانے کے بعد اور ساری مخلوق کے موت کی آغوش میں سو جانے کے بعد خداوند تعالیٰ اُس سمندر کو (جس کو "بحر المسجور" فرمایا ہے اور جس کا پانی ایسا لسدار ہے گویا مادّہ منویہ) بارش کا حکم دے گا۔

پس جب یہ پانی پُرانے سے پُرانے مردوں کو چھو جائے تو وہ مُردے زندہ ہو کر اُٹھ کھڑے ہوں گے۔" اس طرح مسجور اور بارش کے پانی کی معصومین تعلیمات کے تحت ایک علمی اور دانشورانہ موافقت ہے۔ علم سائنس کے نظریہ کے تحت بیجوں والا لفظ انتہائی اہم اور غور طلب ہے۔ جس طرح بارش کے پانی سے درختوں اور نباتات کے بیج اپنی قوت نمو کا مظاہرہ کرنے لگتے ہیں اسی طرح انسان کے دوبارہ زندہ ہو اُٹھنے کے

مقصد سے خدا اپنی منشاء کے مطابق ایک مخصوص بارش کرے گا جو جسم انسانی کے کسی مخصوص حصے میں پوشیدہ "تخم لازوال" پر اپنا کیمیاوی اثر کرے گی۔ اس ارشاد پروردگار سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ جسم انسانی میں کوئی ایک مخصوص چیز (جز و بدن) ضرور ہوتی ہے جو نہ تو کبھی ضائع ہوتی ہے نہ اسے زمین ختم کر سکتی ہے اور نہ وہ جزو حشرات الارض کی خوراک بن سکتی ہے۔ یہاں تک کہ لاکھوں اور کروڑوں سال زیر زمین رہ کر بھی فنا نہیں ہوتی اور اس حقیقت کی طرف قرآن حکیم نے واضح طور سے ارشاد کیا ہے۔

"بھلا جب ہم مر جائیں گے اور سڑ گل کر مٹی ہو جائیں گے تو پھر یہ دوبارہ زندہ ہونا (عقل سے) بعید ہے ان کے جسموں سے زمین جس جس چیز کو (کھا کھا کر) کم کرتی ہے وہ ہم کو معلوم ہے۔ اور یہ حقیقت تو ہمارے پاس تحریری یادداشت (لوح محفوظ) میں درج ہے۔" (۵۰۔۳ تا ۴)۔

اس آیت میں خالق کائنات کا واضح ارشاد ہے کہ زمین تمہارے جسموں سے جن جن چیزوں کو کھا لیتی ہے وہ مجھے معلوم ہے اور جس چیز کو نہیں کھا پاتی وہ بھی مجھے معلوم ہے اور یہ اس قدر اہم علمی معلومات ہے جو یادداشت کے طور پر لوح محفوظ میں بھی درج ہے اور تحریری شکل میں بھی محفوظ ہے۔ ان حقائق کے پیش نظر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انسان کے جسم میں اس کا کوئی ایک ایسا انتہائی اہم جزو ہوتا ہے جو نہ تو کبھی فنا ہوتا ہے۔ نہ اسے زمین ضائع کر سکتی ہے اور نہ اسے حشرات الارض کھا کر ختم کر سکتے ہیں اور اسی جزو بدن کو "تخم انسانی" یا تخم حیات کہہ سکتے ہیں۔!!

میرے عقل ناقص ادراک ناتواں نے اس کا نام "تخم لازوال" دیا ہے۔ اور پھر

ایک مقررہ وقت پر آب مسجور کا اُن تخم حیات تک پہنچ جانا بھی ممکن اور لازمی ہو جائے گا جب زمین ان تخم لازوال کو اُن کے پُرانے اور دیرینہ مدفنوں سے باہر نکال چکی ہو گی اور آب مسجور کی بارش بھی لگاتار چالیس دنوں تک ہوتی رہے گی۔

انسان کے دوبارہ زندہ ہو اُٹھنے کی مثال نباتات اور پودوں کے بیجوں سے دے کر خداوند کریم نے اس رُمز کی عقدہ کشائی کی ہے کہ جسم انسانی میں بھی ایک تخم لازوال ہوتی ہے جسے نہ تو زمین کھا پاتی ہے اور نہ اس پر عناصر اربعہ کا بھی کوئی اثر ہو سکتا ہے۔ یہ تخم لازوال آب مسجور کی قربت اتصال سے اپنی قوت جاذبہ اور اپنے اندر دبی ہوئی قوت نمو اور قوت حیات کے ساتھ بیدار ہو جائے گی اور اپنے جسم کے دوسرے اعضاء اور اس کی مٹی کو خواہ وہ کہیں بھی ہو گی اپنی طرف مائل کر لے گی جنھیں آب مسجور دوبارہ متحد کر کے پہلی جیسی حالتوں میں لا چکا ہو گا۔ اور اس طرح خدا کی قدرت کاملہ سے لاکھوں سال پُرانے مُردے اپنی پہلے جیسی اور بہتریں صورتوں میں دوبارہ واپس آ سکیں گے اور زندہ ہو کر اٹھ کھڑے ہوں گے۔ شاید اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت علیؑ نے فرمایا ہے۔ "جب سلسلۂ امور ٹوٹ جائے گا۔ زمانے گزر جائے گے۔ یوم نشور قریب آئے گا تو خدا لوگوں کو قبروں سے۔ پرندوں کے گھونسلوں سے۔ درندوں کے بھٹوں سے۔ ہلاکت گاہوں سے اس طرح نکالے گا کہ اس کے حکم کی طرف دوڑ رہے ہوں گے۔ با جماعت۔ صف در صف۔ کھڑے ہو کر۔ خاموشی کے ساتھ اس کے معاد کی طرف چل رہے ہوں گے اور سرنگوں ہوں گے حیلے بیکار ہو چکے ہوں گے۔ آوازیں کانپ رہی ہوں گی۔"

(نہج البلاغت)

تخم لازوال

"تخم لازوال" حیات بعد از موت کے سلسلے کی ایک انتہائی اہم کڑی ہے جس پر قرآن حکیم کے اشارات اور احادیث معصومین کی رہبری میں موجودہ میڈیکل سائنس کا مطالعہ کرنے کے بعد بڑے مدلل نتیجے حاصل کئے جاسکتے ہیں۔ میں نے اپنی آزادی فکر کو بروئے کار لاتے ہوئے اس سلسلے میں جو بھی نتائج اخذ کئے ہیں انھیں اپنی کوتاہ عقلی اور کم مائیگی کا اعتراف کرتے ہوئے قارئین کی خدمت میں انتہائی معذرت کے ساتھ پیش کر رہا ہوں۔ اور مجھے امید ہے کہ میرا خدا میری اس کاوشِ جاہلانہ اور دلائل احمقانہ کے لئے مجھے ضرور معاف فرمائے گا۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے قرآن حکیم کی ان آیات حکیمانہ کا حوالہ دینا ضروری ہوگا جو اس حقیقت کی طرف انتہائی واضح الفاظ میں رہبری کر رہی ہیں۔ "بھلا جب ہم مر جائیں گے اور (سڑ گل) کر مٹی ہو جائیں گے تو پھر یہ دوبارہ زندہ ہونا (عقل سے) بعید بات ہے۔ ان کے جسموں سے زمین جس جس چیز کو کم کرتی ہے (ختم کر دیتی ہے) وہ ہم کو معلوم ہے۔ اور ہمارے پاس تو تحریری یادداشت کتاب (لوح محفوظ) میں موجود ہے۔" (۵۰۔۳ تا ۴)۔

ان آیات پُر از حکمت سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انسان کے جسم کا کوئی عضو یا جُز ایسا ضرور ہے جسے نہ تو حشرات الارض کھا کر ختم کر سکتے ہیں اور نہ زمین ہی ضائع کر سکتی ہے۔ اور نہ یہ زمانہ کے ساتھ مائل بہ فنا ہوتے ہیں۔ اسی سورہ میں آگے چل کر ہماری رہبری ان الفاظ میں ہوتی ہے۔

"اور پانی سے ہم نے مردہ شہر (بنجر زمین) کو زندہ کیا (بیجوں سے پودے اگائے)

اسی طرح (روز حشر) مُردوں کو اٹھانا ہوگا۔" (۵۰۔۱۱) اس آیت گرامی میں نباتات کے بیجوں کا ذکر کرتے ہوئے انسان کی اُس "تخم لازوال" کی طرف اشارہ ہو رہا ہے۔ پھر اسی سورہ میں آگے چل کر انسان کے دوبارہ زندہ ہو اٹھنے کا خصوصیت کے ساتھ اعلان ہو رہا ہے۔

"تو کیا ہم پہلی بار پیدا کر کے تھک گئے ہیں (ہرگز نہیں) مگر یہ لوگ تو از سر نو (دوبارہ) پیدا کرنے کی نسبت شک میں پڑے ہوئے ہیں۔" (۵۰۔۱۵)

قرآن حکیم کی پُر از حکمت آیات سے بنیادی رہبری حاصل کر لینے کے بعد وجود انسانی اور اس کے منبع زندگی کی طرف بھی قرآن حکیم نے مندرجہ ذیل آیات میں رہبری کی ہے۔

"انسان کو دیکھنا چاہیئے کہ وہ کس چیز سے پیدا ہوا ہے۔ وہ اچھلتے ہوئے پانی (نطفہ) سے پیدا ہوا ہے جو پیٹھ اور سینہ کی ہڈیوں کے بیچ سے نکلتا ہے۔ بے شک خدا ان کے دوبارہ (پیدا کرنے) کی قدرت رکھتا ہے۔" (۸۶۔۶ تا ۸)۔

اس سلسلے میں علم سائنس اور جدید علم طب کے نظریات بھی قرآن حکیم سے متفق نظر آتے ہیں۔ زمانہ قدیم نے بقراط جو اپنے زمانہ کا نامی حکیم گزرا ہے اس کا قول ہے کہ مادّہ منویہ دماغ میں پیدا ہوتا ہے۔ پھر وہاں سے دو رگوں کے ذریعہ سے جو کانوں کے بیچ میں سے ہو کر حرام مغز میں آتی ہے۔ پھر جگر کے دو رگوں سے جو حرام مغز سے ملی ہوئی ہوتی ہیں ہو کر گردوں میں آتی ہے اور اس طرح یہ سلسلہ وار ہوتی ہوئی مخارج سے باہر آتی ہے۔ دور قدیم میں نہ تو میڈیکل سائنس اس قدر وسیع تھی اور نہ ہی اس علم میں آج کے موجودہ دور کی طرح تحقیق اور دریافت ہی حاصل ہو پاتی تھی۔

لیکن موجودہ دور میں جب کہ میڈیکل سائنس اپنے انتہائی عروج تک پہنچ چکا ہے اور اس میں آئے دن نئی نئی دریافتیں ہو رہی ہیں وہ سب قرآن حکیم سے مکمل اتفاق کرتی نظر آ رہی ہیں اور موجودہ میڈیکل سائنس کا نظریہ بھی یہی ہے کہ مادہ منویہ ہر عضو بدن سے جدا ہو کر دماغ میں اکٹھا ہوتا ہے۔ اور وہاں سے حرام مغز میں ہوتا ہوا گردوں میں آتا ہے۔ پھر گردوں میں پختہ ہو کر خون کی شکل میں خصیتین میں آتا ہے۔ اور وہاں سے مادہ منویہ (نطفہ) بن کر باہر نکلتا ہے۔ قرآن حکیم بھی انھیں بنیادی تعلیمات کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ جس کی آیات کے مطابق بھی گردے اور حرام مغز ہی مادہ منویہ کے پختہ ریز ہونے کی جگہیں ہیں اور گردوں اور حرام مغز کے پیٹھ اور سینہ کی ہڈیوں کے درمیان ہونے میں کوئی شک نہیں ہے اور اس کا منبع جدید میڈیکل سائنس کے مطابق بھی دماغ ہی ہے۔ جس کا تفصیلی جائزہ لینے سے پہلے قرآن اور احادیث معصومینؑ کی رہبری میں اس مقام مخصوصہ کا تعین کرنا ضروری ہوگا۔

قرآن حکیم میں حضرت ابراہیمؑ کی خواہش پر خداوند کریم کے پرندوں کو دوبارہ زندہ کر دینے والی آیات انتہائی غور طلب اور نتیجہ خیز ہیں۔ اور ہماری اس کاوش میں راہ نمائی بھی کر رہی ہیں۔

"(اے رسولؐ وہ واقعہ بھی یاد کرو) جب ابراہیم نے (خدا سے) درخواست کی کہ اے میرے پروردگار مجھے دکھلا دے کہ تو مردوں کو کیونکر زندہ کرے گا۔ تو خدا نے فرمایا کہ کیا تمہیں (اس کا) یقین نہیں ہے۔ ابراہیم نے عرض کی کہ (اے میرے پروردگار یقین تو ہے مگر آنکھ سے اس لئے دیکھنا چاہتا ہوں کہ میرے دل کو اطمینان ہو جائے۔ فرمایا کہ (اگر یہ چاہتے ہو) تو چار پرندوں کو اپنے پاس منگوا لو (اور ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالو

پھر ہر پہاڑ پر اس کا ایک ایک ٹکڑا رکھ آؤ۔ اس کے بعد ان کو بلاؤ (پھر دیکھو کہ) کیونکر وہ سب تمہارے پاس دوڑتے ہوئے آتے ہیں۔ اور سمجھ رکھو کہ خدا بیشک غالب اور حکمت والا ہے۔" (۲:۲۶۰)۔

اس آیت کے سلسلے میں کئی مستند احادیث اور روایات بھی ہیں کہ " وہ چاروں پرندے مرغ۔ گدھ مور اور بطخ تھے جنہیں حضرت ابراہیمؑ نے ٹکڑے ٹکڑے کر کے ایک ہی میں ملا دیا اور اس کے بعد سب کو کوٹ پیس کر میدہ کر دیا یہاں تک کہ سب ایک ہو گئے۔ اس کے بعد اس کے دس حصے کر کے پہاڑوں پر رکھ آئے۔ پھر چاروں کو پکارا۔ ایک ایک پرندہ اپنی اپنی جگہ سے آ کر اپنی اپنی چونچ سے جا ملا۔ (جن کے سر حضرت ابراہیمؑ نے غالباً بحکم الٰہی اپنے پاس رکھ لئے تھے)۔ اور اس طرح ہر پرندہ اپنی پہلی صورت پر آ کر زندہ ہو گیا۔ حضرت ابراہیمؑ قصداً ایک کی چونچ دوسرے کے بدن سے ملاتے تھے مگر وہ ہٹ کر اپنی چونچ کی طرف رخ کرتا تھا۔"

(قرآن حکیم با تفسیر مولانا فرمان علی قبلہ ص ۶۸)۔

اسی حدیث کو مولانا مقبول احمد قبلہ نے بھی اپنے کلام مجید با تفسیر ص۹۵ پر اس اضافت کے ساتھ درج کیا ہے کہ یہ حدیث کافی اور تفسیر عیاشی میں امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے کہ اسی طرح پرندوں کے دوبارہ زندہ ہو جانے کی روایت ملا جامی تحریر فرماتے ہیں کہ " ایک شخص نے صادق آل محمدؐ سے پوچھا کہ مولا حضرت ابراہیمؑ نے جو چار چڑیوں کو زندہ کیا تھا وہ چاروں (پرندے) ہم جنس تھے یا مختلف اجناس کے تھے۔ حضرت نے اس تعجبانہ سوال کو سن کر فرمایا کہ دیکھو حضرت ابراہیمؑ نے اس طرح زندہ کیا تھا۔ یہ فرما کر آپ نے آواز دی۔ طاؤس یہاں آ۔ غراب یہاں آ۔

باز یہاں آ۔ کبوتر یہاں۔ یہ چاروں پرندے حضرت کے پاس آ گئے۔ آپ نے حکم دیا کہ انھیں ذبح کر کے ان کے گوشت پیس ڈالو۔ اس کے بعد آپ نے ان میں سے ہر ایک کا سر ہاتھ میں لے کر ایک ایک کو آواز دی۔ آواز کے ساتھ گوشت اڑا اور اپنے اپنے سر سے جا ملا۔ پرندہ مکمل ہوا اور اس کے بال و پر مکمل ہو گئے اور پرندے زندہ ہو گئے۔ یہ دیکھ کر سائل حیران رہ گیا۔" (چودہ ستارے ص ۳۵۹)۔

قرآن حکیم اور ارشاد و معجزات معصومینؑ کی روشنی میں اس حقیقت کا انکشاف ہو جاتا ہے کہ "تخم لازوال" کسی جگہ انسان کے سر (دماغ) میں ہی کسی جگہ ہوتی ہے۔

اس سلسلے میں امام جعفر صادقؑ کی وہ روایت بھی اس حقیقت کی دلیل میں پیش کی جا سکتی ہے کہ جب آپ سے سوال کیا گیا کہ "کیا میت کا جسم بوسیدہ ہو جاتا ہے"؟ اس پر آپ نے وضاحت فرمائی کہ "ہاں۔ یہاں تک کہ ہڈی اور گوشت بھی ختم ہو جاتا ہے۔ صرف اس کی وہ مٹی جس سے اُسے خلق کیا گیا ہے قبر کے اندر "مستدیرہ" صورت میں باقی رہ جاتی ہے جس سے پھر خدا انسان کو دوبارہ پہلے کی طرح پیدا کرتا ہے۔ (فروغ کافی جزو ۳۔ ص ۲۵۱)۔ اور اردو لغت کے مطابق "مستدیر" گول مٹول سی مستحکم شے کو کہتے ہیں۔ اس طرح قرآن حکیم اور احادیث معصومین کے پیش نظر اس حقیقت کو قبول کرنا ہو گا کہ "تخم لازوال" کبھی فنا نہیں ہو سکتی اور اس کا وجود انسان کی کھوپڑی کے کسی حصے میں ہی ہو سکتا ہے۔

اس کے بعد اس سلسلے میں جب ہم جدید علم سائنس اور میڈیکل سائنس میں تحقیق کرتے ہیں تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جس طرح نباتات اور درختوں کے ننھے ننھے حقیر سے بیجوں میں درخت۔ جڑوں۔ پتوں۔ مختلف رنگوں اور نسلوں پھلوں پھولوں۔

خوشبوؤں کے تمام اجزاء اور عناصر محفوظ ہوتے ہیں۔ اسی ایک بیج میں لذّت کے رموز بھی پوشیدہ ہوتے ہیں۔ پھولوں کی رنگت اور ان کے خوشبو کی صفات بھی پنہاں ہوتی ہیں اسی طرح انسان کے ایک خلیہ (تخم لازوال) میں انسان کے تمام اجزاء جسمانی۔ پنجر۔ رنگ روپ اور تمام کا تمام پیکر انسانی اور زندہ جرثومے بھی پائے جاتے ہیں۔ جو نہ تو کبھی خراب ہوتے ہیں۔ نہ اسے حشرات الارض کھا پاتے ہیں اور نہ گردش زمانہ اور ادوار اسے کبھی فنا کر سکتے ہیں اور وہ دوبارہ زندہ ہو اٹھنے کی صلاحیت اور قوت رکھتے ہیں۔ اور اب جب کہ یہ حقیقت بھی واضح ہو چکی ہے کہ ایسی تخم لازوال سر (کھوپڑی) کے ہی کسی حصے میں ہوتی ہو گی۔

اتنی ساری معلومات اور رہبری حاصل کر لینے کے بعد جب میں نے کافی تلاش و تحقیق کی تو میڈیکل سائنس میں جہاں تک میرے ذہن نارسا نے رہبری کی مجھے انسانی کھوپڑی میں دو ایسے ہی اہم اجزاء نظر آئے جن میں سے ایک کو "پٹیوٹری غدود" Pituitary Gland اور دوسرے کو پائنل باڈی (Pineal Body) کہتے ہیں اور جو "تخم لازوال" کے سلسلے کی اہم کڑی ہو سکتے ہیں۔ مناسب ہو گا اگر ان کا ایک اجمالی جائزہ لیا جائے۔ میں نہ تو کبھی میڈیکل سائنس کا طالب علم ہی رہا ہوں اور نہ میری عملی زندگی میں میڈیکل سائنس سے کبھی سابقہ رہا ہے مگر تخم لازوال کی تلاش و تحقیق میں میری متجسس نگاہوں نے میڈیکل سائنس کی کتابوں اور انسائیکلوپیڈیا وغیرہ جیسی مستند کتابوں سے جو بھی حاصل کیا ہے وہ خداوند علیم و حکیم سے اپنی علمی کم مائیگی کا اعتراف کرتے ہوئے قارئین کی خدمت میں پیش کئے دے رہا ہوں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

پٹیوٹری گلانڈ (غدود) Pituitary Gland.

"تخم لازوال" (تخم انسانی) کی قرآن اور احادیث معصومین اور ابتدائی علم طب کی رہبری میں میری تجسس نگاہیں انسان کی کھوپڑی (سر) کے اعضاء رئیسہ کی طرف اٹھیں اور مجھے میڈیکل سائنس کی کتابوں میں کھوپڑی (سر) کے متعلق تفصیلات میں جانے کے بعد ایک انتہائی اہم اور قابل غور "غدود" Gland; نظریات جیسے میڈیکل سائنس نے "پٹیوٹری گلانڈ" Pituitary Gland; کا نام دیا ہے۔ اس کی اہمیت کے پیش نظر اس غدود کو ماسٹر گلانڈ Master Gland; بھی کہتے ہیں۔ اس گلانڈ کے مقاصد عظیم ہیں۔ یہ غدود جسم کے سارے اعضاء رئیسہ کو اپنی اصلی حالت میں قائم رکھنے۔ ان کے حرکت وعمل کو جاری رکھنے اور ان کی پرورش۔ مرمت اور صحت کو قائم رکھنے میں نمایاں کام انجام دیتا ہے۔ یہ ننھا سا بیضوی (مخروطی) غدود اپنے اندر ایسی رطوبت Hormone; پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے جو ایک انتہائی مخصوص کیمیاوی اہمیت کی حامل ہوتی ہے اس رطوبت سے جسم کے اعضاء رئیسہ کے بیمار ہونے خراب ہونے۔ ٹوٹنے پھوٹنے کے بعد شفاء اور مرمت ہوتی ہے۔ یہ گلانڈ ایسا ہارمون پیدا کرتا ہے جو فرسودہ اور خستہ ہوتے ہوئے خلیوں CELLS کی جگہ دوسرے خلیوں کی تخلیق بھی کرتا ہے۔ اس طرح یہ غدود (گلانڈ) سانس کی اور خوراک کی نلیوں کی صفائی چھاتیوں اور گردوں کے سارے غدودوں کی صحت۔ رحم اور بچہ دانیوں اور مردانہ بیضوں کی کیمیاوی طریقوں سے ردّوبدل اور مرمت کرتا ہے۔ مختصر یہ کہ یہ غدود سر سے پیر تک انسانی جسم کے تمام دوسرے غدودوں کی دیکھ بھال اور مرمت کرتا ہے اور انھیں تقویت بھی پہنچاتا رہتا ہے۔ اس طرح یہ گلانڈ سارے جسد انسانی کے دوسرے اجزاء۔ اعضاء رئیسہ اور غدودوں کی دیکھ بھال۔ مرمت اور تخلیق نو کے ایک عظیم

کارخانے یا کنٹرول روم کا کام کرتا ہے۔

میڈیکل سائنس نے انسان کی کھوپڑی کے اندر اس اہم "پٹیوٹری گلانڈ" کے محل وقوع کی تشریح کچھ اس طرح سے کی ہے۔ "انسان کی کھوپڑی کی بنیادی ہڈی اسفینائڈ بون Sphenoid Bone; جو ایک پچر کے شکل کی Wedged Shape. ایک طرف موٹی اور دوسری طرف پتلی ہوتی ہے یہ غدود اسی ہڈی کے مرکز میں مخروطی شکل کے ایک دبے ہوئے سے گڑھے میں واقع ہوتا ہے۔ جو خود بھی مخروطی (بیضوی) کی شکل کا کچھ سرخی مائل بھورے رنگ کا ہوتا ہے۔ مختصر یہ کہ یہ بیضوی شکل کا غدود دماغ کی نچلی سطح پر کھوپڑی کے Base Bone; (بیس بون) بنیادی ہڈی پر پائے جانے والے دبے ہوئے گڑھے میں ہوتا ہے۔"

"یہ غدود دماغ سے بھی ایک ڈنٹھل نما تنے کے ذریعہ سے جڑا ہوتا ہے۔ بالغ انسان کے اس غدود کا وزن 0.5; گرام سے 0.7; گرام تک ہوتا ہے۔ مردوں کی بہ نسبت عورتوں کا یہ غدود سائز میں کچھ بڑا ہوتا ہے اور وزن میں بھی زیادہ ہوتا ہے۔ یہ غدود چالیس سال کی عمر تک بڑھتا ہے اور پھر اس کے بعد کم ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ اس گلانڈ کے سامنے کا سائز 10 mm; پیچھے کا سائز 6 mm; اور چوڑائی تقریباً 13 mm; ہوتی ہے۔"

اس غدود کو تمام جسم انسانی کے نظام کو قائم رکھنے کا کنٹرول روم کہہ سکتے ہیں جو ایک کیمیاوی رطوبت Hormone; پیدا کر کے اسے خصوصی نلیوں Tubes; کے ذریعہ سے جسم کے تمام اعضاء رئیسہ کو خون کے ذریعہ سے مہیا کرتا رہتا ہے۔ یہ رطوبت انسانی زندگی کے حرکت وعمل کو عملی خوبیوں کے ساتھ قائم رکھتی ہے اس غدود کے چند

اہم کردار کا ذکر اختصار کے ساتھ کردینا ضروری ہوگا۔

(۱) اس غدود سے ایسی کیمیاوی رطوبت Hor-mones کا اخراج ہوتا ہے جو Tubes; نلیوں کے ذریعہ خون اور پھر تمام اعضاء رئیسہ تک پہنچتی رہتی ہے۔ جس سے ہڈیوں کی مرمت۔ پرورش وپرداخت ہوتی رہتی ہے۔ (۲) اس غدود کا کام جسم کے اندر تیزابی اثرات کو اعتدال پر قائم رکھنا، گیس اور بادی اثرات اور چربی کو حدّ اعتدال کے اندر برقرار رکھنا بھی ہے ساتھ ہی ساتھ اس رطوبت کا کام نشاستہ۔ مادّ دل سے متعلق پٹھوں اور نلیوں کو اعتدال پر قائم رکھنا اور ان کی نگہداشت کرنا بھی ہے۔ (۳) اس غدود کا کام Iodine; آیوڈین اور جرثومہ کش Antiseptic; رطوبت کا تیار کرنا بھی ہے۔ جس میں اعضاء انسانی کا سڑنے گلنے سے تحفّظ اور انھیں اندرونی اور بیرونی زہریلے مادّوں سے محفوظ رکھنا شامل ہے۔ (۴) گردوں اور اس کے پٹھوں۔ رگوں اور نلیوں کی نگہداشت۔ علاج اور اصلاح بھی اسی گلانڈ کے ذمہ ہوتی ہے۔ (۵) مردانہ بیضوں سے متعلق پٹھو اور غدّوں اور ان نلیوں کی نگہداشت اور اصلاح جس کا تعلق گردوں سے بھی ہوتا ہے۔ مردانہ مادّہ منویہ۔ مردانہ اعضاء کی تکمیل۔ آواز کا بھاری پن اور مردانہ خصوصیات کا پروان اور ان کی پرورش کرنا (۶) خصیوں اور بیضوں کے عمومی اعمال وافعال کی نگہداشت۔ مردانہ نطفہ کے ٹیوب اور نلیوں میں تولیدی جرثوموں کی بقاء اور استحکام۔ ان کی پرورش اور تحفّظ۔ اور اسی طرح زنانہ بیضوں کے صحت مند افعال اور بچّہ دانیوں میں حمل کا تحفّظ۔ ایام حمل میں بچّہ دانی کا تحفظ۔ بچہ دانی کی پرورش اور اس کی مناسب نقل وحرکت کو عملی خوبیوں کے ساتھ قائم رکھنا۔ (۷) زنانہ پستانوں کے غدودوں کا تحفظ۔ ان میں دودھ پیدا کرنے

کی صلاحیت اور عمل کو قائم رکھنا۔ بچہ دانی کے زخموں اور خون کے جاری رکھنے کے عمل کو پابندی اور اعتدال کے اندر رکھنا۔ (۸) بالوں اور رویوں کے سلسلے کا کنٹرول۔ (۹) رنگوں، شباہتوں کے رموز اور ان کی نگہداشت (۱۰) کھالوں کو بیرونی وبازتوں سے بچانا اور انھیں اعتدال پر قائم رکھنا۔ کھالوں کے کٹنے۔ جلنے اور دوسری جلدی بیماریوں سے تحفّظ اور نگہداشت کرتے ہوئے اُسے صحت مند رکھنا (۱۱) دوران خون پر کنٹرول اسے اور اُسے معمول کے مطابق اور حد کے اندر قائم رکھنا۔ رگوں اور شریانوں پر خون کے دباؤ کو متوازی اور ہموار رکھنا (۱۲) گردوں کی نلیوں میں پائی جانے والی رطوبت اور آبی مقدار کا حسب معمول اخراج اور صلاحیت کو قائم رکھنا۔ (۱۳) تولید کے بعد زچہ کی چھاتی کے غدود میں دودھ کی دھار نکالنے کی صلاحیت کو قائم رکھنا۔ (۱۴) بچہ دانی کے غضلات میں سکڑنے کا عمل اور دوران ولادت بچہ دانی اور حمل کو موزوں حالت میں قائم رکھنے کا عمل"۔ یہ ایسے خصوصی اعمال ہیں جنہیں پیٹوٹری گلانڈ Pituitary Gland; انجام دیتا ہے۔ اس کے علاوہ ان سے جڑے ہوئے بیشمار عمومی عمل بھی ہیں جنہیں یہ غدود انجام دیتا ہے۔

میڈیکل سائنس سے حاصل شدہ ان معلومات کے بعد یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ جسد انسانی کا کوئی بھی عضو ایسا نہیں ہے کہ جس کی نگرانی اور دیکھ بھال اور ان کا فطری علاج اس غدود Gland کے تحت نہ ہوتا ہو۔ جسم کے بال۔ روئیں۔ رنگ ونسل سے لے کر دل۔ دماغ۔ جگر۔ گردے تک یہ سب اسی گلانڈ سے زندگی حاصل کرتے ہیں۔ پھیپھڑوں کی حرکت۔ دل کی دھڑکن۔ عمل تولید یہ سب اسی غدود کی اناعت اور اعانت سے محو عمل ہیں۔

اس کے بعد اب ہم بغور مطالعہ کرتے ہیں اسی اہم گلانڈ سے جڑی ہوئی ایک ایسی اہم اور مخفی شے کا جو حیرت انگیز ڈھنگ سے خاموش اور خفتہ ہے مگر اپنے اندر ایک راز سربستہ لئے ہوئے ہے۔ باہر سے دیکھنے میں ساکت مگر اندرونی طور سے ایک طلسم خاموش۔ ایک ایسا راز جو آج تک حل نہیں کیا جا سکا اور جسے ماہرین میڈیکل سائنس نے پائنل باڈی ;Pineal Body کا نام دیا ہے۔

(پائنل باڈی) Pineal Body; ”تخم لازوال کی متلاشی اور متجسس نگاہیں“:

پٹیوٹری گلانڈ کے مطالعہ کے بعد اسی اہم گلانڈ سے جڑی ہوئی اس راز سربستہ شے پر رک جاتی ہیں۔ ماہرین میڈیکل سائنس نے اس کا نام چیڑ PINE کے پھل کی مناسبت سے دیا ہے جو ایک کون ;Cone کی شکل کا ہوتا ہے ”▲“ یعنی نیچے سے بڑا گول اور اوپر کو گاؤدم ہوتا ہوا نوکیلا ہو جاتا ہے دیکھنے میں یہ لمبوترا اور ٹھوس ہوتا ہے مخروطی شکل کا گول مٹول (شاید خاک مستدیر کا ہم شکل!) میڈیکل سائنس نے اس کی جو تعریف اور تفصیل لکھی ہے اُسے میں انھیں کے لفظوں میں دہرائے دے رہا ہوں۔

A small reddish-grey conical structure on the dorsal surface of the mid-brain. Its functions are not fully understood. But there is some evidence that it is an endocrine gland concerned with growth". Conical;

”یہ ایک چھوٹی سی سرخی مائل بھورے رنگ کی ٹھوس اور مخروطی کونیکل

ساخت کی شے ہے جو مرکزی دماغ کے پچھلی سطح پر ہوتی ہے۔ اس پیچیدہ شے کی کارکردگی اور فعل وعمل کے متعلق میڈیکل سائنس کو آج تک کوئی واضح علم نہیں ہو سکا ہے۔ مگر ایسا اندازہ لگایا جاتا ہے کہ یہ کسی طرح کے ہارمونس بنانے والے غدودوں میں سے ہو سکتا ہے۔“ ”اس غیر واضح شے کا سلسلے اوپر دیئے گئے اہم پٹیوٹری گلانڈ سے جڑا ہوتا ہے۔“

کون جانے یہ غیر واضح اور مبہم شے ہی اُس کنٹرول روم کو توانائی دیتی ہو۔ ممکن ہے یہ کونیکل شے ہی ”تخم لازوال“ ہو ہو سکتا ہے۔ یہی تخم انسانی ہو۔ ہو سکتا ہے اس کے اندر قدرت کے ایسے علوم خفتہ اور راز سربستہ بند ہوں جو تخم لازوال کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ ہو سکتا ہے اسی شے کی طرف امام جعفر صادقؑ نے ”خاک مستدیر“ کہہ کر اشارہ کیا ہو۔ جو کبھی اور کسی حالت میں بھی فنا نہ ہوتی ہو اور نہ حوادث روزگار اسے ختم کر سکتے ہوں۔ اور پھر ایک دن ”آب مسجور“ کی قربت اتصال حاصل کر لینے کے بعد اس کے اندر مچلتی ہوئی زندگی اور عظیم قوت جاذبہ اپنی تمام اہلیتوں اور صلاحیتوں کے ساتھ بیدار ہو جائے اور اپنی قوت کشش مرکزی کے زیر اثر جسد انسانی کو دوبارہ مکمل کر سکے۔ ہو سکتا ہے کہ نباتات کے بیجوں کی طرح یہ بھی آب مسجور کی بارش کے بعد اپنی پوری عملی خصوصیات کے ساتھ بیدار ہو اُٹھے۔ اور حیات بعد از موت سے ہر طرح سے متعلق ہو جائے جو آج اس قدر لاتعلق اور خاموش نظر آرہی ہے بالکل نباتات کے بیج کی طرح۔ واللہ اعلم بالصواب۔

دوسرے نفخ صور کے بعد

:- حضرت اسرافیل دوسرا صور بھی پہلے نفخ صور

کے بعد (اسی طرح) جب خدا چاہے گا پھونکینگے اور اس درمیانی مدت میں جو لازماً ایک مدت معینہ کے بعد ہی ہوگی اور جب میدان حشر کا اہتمام ہوگا۔ ایک ایسا میدان جس میں نہ بلندیاں ہوں گی اور نہ پستیاں ہوں گی۔ نہ کوئی رخنے ہوں اور نہ دراڑیں اور جب سطح زمین پر ہر طرف مردہ لاشیں اپنی اصلی حالت میں اور اپنی زندگی کی بہترین شکلوں میں تبدیل ہوچکی ہوں گی آب مسجور کے اتصال سے تخم حیات (تخم لازوال) میں قوت نمو پیدا ہو اٹھی ہوگی اور کششِ اتصال سے اس میں کشش مرکزی پیدا ہوچکی ہوگی اور مردے اپنے زندگی کی بہترین شکلوں میں واپس آچکے ہوں گے۔ ان کی ہڈیوں کے ڈھانچوں پر رگیں۔ پٹھے۔ گوشت اور کھال پہلے کی طرح اگ آئی ہوگی۔ اور پھر خدا حکیم کے حکم سے "روحیں جسموں سے ملادی جائیں گی"۔ اور انسان میدان حشر کی طرف چل پڑے گا۔ اور یہ سب خداوند کریم وحکیم کے عین مرضی کے مطابق ہوگا۔

"جس دن صور پھونکا جائے گا اور گنہگاروں کو ہم نیلی آنکھوں کے ساتھ محشور کریں گے جو چپکے چپکے کہہ رہے ہوں گے کہ ہم دنیا میں کوئی دس دن رہے ہوں گے۔ جو ان میں زیادہ ہوشیار ہوگا وہ کہے گا کہ نہیں جی ہم تو بس بہت ٹھہرے ہوں گے تو ایک دن"۔ (۲۰۔۱۰۲ تا ۱۰۴)۔

(اس دن کو یاد کرو) جس دن صور پھونکا جائے گا تو جتنے لوگ آسمانوں میں ہیں اور جتنے لوگ زمین پر ہیں سب کے سب گھبرا اٹھینگے (اپنے انجام کے خوف و دہشت سے۔ مگر جس کو خدا چاہے گا (وہ مطمئن ہوگا) (۲۷۔۸۷)۔

"اور پھر جب دوبارہ صور پھونکا جائے گا تو لوگ اسی دم (اپنے اپنے مدفنوں سے)

نکل کر اپنے پروردگار کی طرف چل پڑیں گے (پھر حیران ہو کر کہیں گے) ہائے افسوس ہم تو سو رہے تھے ہمیں ہماری خواب گاہوں سے کس نے جگا اٹھایا۔ جواب دیا جائے گا کہ یہی وہ وقت ہے جس کا وعدہ کیا گیا تھا"۔ (۳۶۔۵۰ تا ۵۱)۔

"بے شک فیصلے کا دن (یہی) مقرر ہے۔ جس دن صور پھونکا جائے گا اور تم لوگ گروہ کے گروہ حاضر ہوگے۔ آسمان کھولے جائیں گے تو اس میں دروازے ہی دروازے ہو جائیں گے"۔ (۷۸۔۱۸)۔

"جس دن روحیں بدنوں سے ملادی جائیں گی"۔ (۸۱۔۷)۔

"تو جب حشر کا غل مچیگا۔ اس دن آدمی اپنے بھائی سے دور بھاگے گا۔ اور اپنے ماں باپ اور اپنی بیوی سے۔ ہر شخص اس روز اپنی ہی فکر میں ہوگا۔ جو اس کی (مصروفیت کے لئے) کافی ہوگا۔ کتنے چہرے اس روز چمک رہے ہوں گے خنداں اور شاداں (یہ نیکوکار ہوں گے) اور کتنے چہرے ہوں گے جن پر گرد پڑی ہوگی اور سیاہی چڑھ رہی ہوگی۔ (یہ بدکار لوگ ہوں گے)۔ (۸۰۔۳۳ تا ۴۱)۔

"پھر جب صور (دوسری بار) پھونکا جائے گا تو فوراً سب کھڑے ہو کر دیکھنے لگیں گے اور زمین اپنے پروردگار کے نور سے چمکنے لگے گی۔ اور پیغمبر اور گواہ حاضر کئے جائیں گے اور ان میں انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیا جائے گا۔ اور بے انصافی نہیں کی جائے گی اور جس شخص نے جو عمل کیا ہوگا اس کو اس کا پورا پورا بدلہ مل جائے گا"۔ (۳۹۔۶۸ تا ۷۰)

حشر کے لغوی معنی کسی گروہ کے ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے یا منتقل کرنے کے ہیں بالکل اسی طرح انسان اپنی قبروں۔ مدفنوں یا جہاں کہیں بھی ان کے "تخم لازوال" دبے ہوں گے زندہ ہو کر میدان حشر کی طرف اپنے معبودِ حقیقی کے حضور میں اپنے

اعمال کے نتائج (اعمال نامے) حاصل کرنے کی غرض سے چل پڑیں گے۔ دوسرے نفخ صور کے بعد انسانی اجسام کے دوبارہ پھر اپنی پہلی حالت میں لوٹ آنے کی طرف بھی خدا نے اپنی قدرت کاملہ کا ذکر اس طرح کیا ہے۔

"میں روز قیامت کی قسم کھاتا ہوں اور (اور برائی سے نفرت کرنے والی) نفس کی قسم کھاتا ہوں (کہ) تم دوبارہ ضرور زندہ کئے جاؤ گے۔ کیا انسان نے یہ خیال کیا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو بوسیدہ ہونے کے بعد جمع نہ کریں گے (ضرور کریں گے) ہم اس پر قادر ہیں کہ اس کی پور پور درست کر دیں گے۔" (۷۵۔ ۱ تا ۴)۔

اس آیت میں پور پور کے درست کر دینے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خالق مطلق نے اپنی کمال قدرت اور بے مثال خلاقی کا ذکر کیا ہے۔ کیونکہ انسان کی انگلیوں کے پوروں پر ایسے اہم۔ قابل توجہ اور قابل اعتماد نشانات اور لکیریں ہیں جو کسی ایک انسان کے دوسرے سے میل نہیں کھاتیں اور ہر شخص کے پوروں کے یہ نشانات الگ الگ ہوتے ہیں۔ ابتدا سے قیامت تک بے شمار انسان پیدا ہو چکے اور پیدا ہوتے رہیں گے لیکن ایسا کبھی دیکھنے میں نہیں آیا کہ کسی دو آدمی کے انگلیوں کے یہ نشانات ایک دوسرے سے ہو بہو مل سکے ہوں۔ ان میں کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی اختلاف ضرور رہا ہے خواہ وہ ایک نقطہ کا ہی رہا ہو۔ یہ نظریہ اس قدر قابل اعتماد مانا جا چکا ہے کہ ہر سرکاری دفتر میں کام کرنے والوں اور یہاں تک کہ سربراہوں اور آفیسروں تک کے انگلیوں کے نشانات ان کی نجی فائلوں میں محفوظ کر لئے جاتے ہیں۔ اسی طرح انگلیوں کے نشانات کی مدد سے کتنے ہی ملزمین بلا کسی شک و شبہ کے پکڑے جاتے ہیں۔

قرآن حکیم کی اس آیت حکیمانہ میں خدا کے کمال قدرت اور خلاقی کے ساتھ ساتھ ایک عظیم علمی حقیقت بھی پنہاں ہے کہ "ہم اس پر قادر ہیں کہ اس کی پور پور درست کر دیں گے۔" انگلیوں کے نشانات (فنگر پرنٹس) کسی بھی ایک انسان کے دوسرے انسان سے ہو بہو اور صد فیصد نہیں ملتے اور ان میں کچھ نہ کچھ اختلاف ضرور ہوتا ہے اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انسان کے انگلیوں کے نشانات وہ واضح نوشتۂ حیات اور اس کے اعمال کے ایسے مستند اور واضح ریکارڈ ہیں جس کو انسان چاہے بھول جائے مگر قدرت کے بنائے ہوئے یہ ریکارڈ اور نشانات نہ تو مٹائے جا سکتے ہیں اور نہ اپنی مرضی کے مطابق بنائے جا سکتے ہیں۔ کبھی کبھی خطرناک اور شاطر مجرم اور قاتل قانون کی گرفت سے بچنے کے لئے اپنی انگلیوں کے نشانات کبھی تیزاب سے تو کبھی دوسرے طریقوں سے جلا کر مٹا ڈالتے ہیں۔ اور اس طرح اگر وہ دنیاوی سزاؤں سے بچ بھی گئے پھر بھی وہ خدا کے سامنے روز محشر نہیں بچ سکیں گے اور قادر مطلق ان کے انگلیوں کے پور پور دوبارہ درست کر دے گا۔

انگلیوں پر بنی ہوئی یہ مخروطی۔ چکردار دھاریاں۔ یہ آڑی ترچھی لکیریں کبھی نہ مٹنے والی تحریریں ہیں جنہیں خدا اپنی قدرت کاملہ سے اسی طرح گویا کر دے گا جس طرح ٹیپ ریکارڈ سے آوازیں نکلتی ہیں اور یہ اس وقت ہوگا جب روز محشر مجرم اپنے گناہوں کا منکر ہوگا اور فرشتے جو اس کی بداعمالیوں اور گناہوں کو لکھتے رہتے ہیں جب ان کے خلاف گواہی دیں گے اور جس وقت مجرم جواب دے گا کہ اے میرے خدا یہ تو تیرے ہی فرشتے ہیں۔ تیری جیسی کہیں گے۔ اس وقت ان کے اعضاء ان کے ہاتھ پیر اور ان کے جسم کے حصے خود ان کے خلاف گواہیاں دیں گے۔ انسان

کی جبینوں اور زبانوں پر بھی طرح طرح کی لکیریں اور مختلف قسم کے نشانات
رہتے ہیں۔ شاید ان میں بھی آوازوں۔ اعمال۔ احساسات کے جذب کر لینے کی
محفوظ کر لینے کی صلاحیت ہوتی ہوگی۔ جسے عقل انسانی کبھی حل نہیں کر سکتی۔
"اس کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں جس کو اس کے (خدا کے) سوا کوئی نہیں
(۶۰-۶)

اسی طرح پیر کے تلوئں۔ چہروں اور جبینوں پر عمر کے ساتھ ساتھ بڑھتی ہو
شکنیں اور لکیریں شاید خدا کی قدرت سے مخفی تحریریں ہیں۔ ان میں کچھ لکیریں
اور دائمی ہیں۔ تو کچھ بنتی اور بگڑتی بھی رہتی ہیں جو اپنے دامن میں ایک عظیم مقص
راز سمیٹے ہوئے ہیں۔ قرآن کا ارشاد ہے۔ "جس دن (روز محشر) ان کی زبانیں
کے ہاتھ اور ان کے پاؤں ان کی بداعمالیوں کی گواہی دیں گے"۔ (۶-۶۰)۔

اسی طرح قرآن حکیم میں گنہگاروں کے اعضاء و جوارح کے ان کے خلاف گ
دینے کے سلسلے میں بڑی وضاحت سے آیا ہے۔ "یہاں تک کہ جب سب کے س
کے پاس لائے جائیں گے تو ان کے کان۔ ان کی آنکھیں۔ اور ان کے (گوشت پو
ان کے مقابلہ میں ان کی کارستانیوں کی گواہی دیں گے۔ اور یہ لوگ اپنے ا
سے کہیں گے کہ تم نے ہمارے خلاف کیوں گواہی دی۔ تو وہ جواب دیں گے ک
خدا نے ہر چیز کو گویا کیا ہے اسی نے ہم کو بھی گویا کر دیا (لوگو) اسی نے تم کو
بار پیدا کیا اور (آخر) اسی کی طرف لوٹ کر جاؤ گے (تمہاری تو حالت یہ
تم لوگ اس خیال سے (اپنے گناہوں کی) پردہ پوشی بھی تو نہیں کرتے کہ تمہ
کان۔ تمہاری آنکھیں اور تمہارے اعضاء تمہارے خلاف گواہیاں دیں گے

تو اس خیال میں بھولے ہوئے تھے کہ خدا تمہارے بہت سے کاموں کو جانتا
نہیں ہے"۔ (۴۱-۲۰ تا ۲۲)۔

انگلیوں کے نشانات (فنگر پرنٹس) کے ذہن میں آنے کے بعد بیسویں صدی
ایک اہم ایجاد "ٹیپ ریکارڈر" کا خیال آجاتا ہے جس میں ہر طرح کے گانے۔
ریں تقاریر اہم بیانات اور راز کی مخفی باتیں محفوظ کی جاسکتی ہیں یا پھر "وی ڈی او
ٹ"، جن کی پلاسٹک کے ٹیپوں پر چلتی پھرتی تصاویر۔ نقشے۔ ہر طرح کے مناظر
تقاریب اور راز کی مخفی چیزیں اور مناظر ٹیپ کئے جاسکتے ہیں اور مستقل ریکارڈ
کلوں میں محفوظ کئے جاسکتے ہیں۔ اور پھر وقت ضرورت انھیں دوبارہ سنا
دیکھا جاسکتا ہے۔

ٹیپ ریکارڈر اور وی۔ ڈی۔ او کیسٹ بیسویں صدی کی ایک عظیم ایجاد ہے۔
ائے میں پلاسٹک کا ایک باریک ٹیپ (فیتہ) استعمال کیا جاتا ہے۔ ٹیپ پر
ے کے سفوف (آئرن آکسائڈ) کا لیپ کیا جاتا ہے۔ یہ ٹیپ دو پھرکیوں
کیسٹ کے اندر فٹ ہوتا ہے۔ جب ٹیپ ریکارڈر کو برقی قوت سے
جاتا ہے تو لوہے کے سفوف کی وجہ سے ٹیپ میں برقی لہریں دوڑنے لگتی
ور اس میں مقناطیسی کشش پیدا ہو جاتی ہے جس کے نتیجے میں یہ آوازوں
ر تقریبات یا نظاروں کی تصویروں کو محفوظ کر لیتا ہے۔ غور کرنے پر ان ٹیپوں
ریک نشانات۔ کچھ دھاریاں۔ اور عام طریقوں سے نظر نہ آنے والے نقات
وتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ یہ ٹیپ اپنی پھرکیوں پر عام حالات میں تقریباً ڈیڑھ
سیکنڈ کی رفتار سے چل کر آوازیں۔ گانے تصاویر اور نقشے وغیرہ ٹیپ کر لیتے

ہیں۔ ٹیپ ریکارڈر کے بند ہوتے ہی ٹیپ پر برقی لہروں کے اثرات ختم ہو جا
ہیں اور دیکھنے میں یہ پلاسٹک کے عام فیتوں جیسا ہی نظر آتا ہے۔ مگر ان محفوظ
کو دوبارہ دیکھا اور سنا جاسکتا ہے۔ اس طرح ان کیسٹوں میں آوازیں۔ بیانات
وغیرہ اپنی مرضی کے مطابق جب تک ضرورت ہو محفوظ رکھا جاسکتا ہے حسب
مٹایا بھی جاسکتا ہے اور ان کی جگہ پر دوسری آوازیں نظارے اور پروگرام دوبارہ
کی جاسکتی ہیں۔

سوچنا چاہئے کہ یہ انگلیوں اور انگوٹھوں کے پوروں پر بنے ہوئے مستقل نش
یہ ہتھیلیوں پر اور پیروں کے پنجوں پر بنتے اور بگڑتے نشانات۔ یہ پیشانیوں کی گ
اور بڑھتی ہوئی شکلیں اور لکیریں کہیں قدرت کے ایسے ٹیپ تو نہیں ہیں جن پر ا
کی زندگی کے نیک و بد اعمال ٹیپ ہوتے جا رہے ہوں جنہیں خالق مطلق جب
بطور ثبوت ہمارے سامنے دوبارہ پیش کر دے۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی قابل غ
کہ انگلیوں اور انگوٹھوں کے نشانات جو نہ تو کبھی مٹتے ہیں اور نہ بگڑتے ہیں بلکہ ا
اور پہلی حالت میں ہمیشہ قائم رہتے ہیں اور ان کی مثال لوح محفوظ کی تحریر و
دی جاسکتی ہے۔

"یہ لوگ، جو کچھ کر چکے ہیں۔ ان کے اعمال ناموں میں درج ہے (یعنی) ہر چھو
کام لکھ دیا ہے"۔ (۵۴۔۵۲ تا ۵۳)۔

"ہم نے ہر چیز کو لکھ کر (لوح محفوظ میں) محفوظ کر رکھا ہے"۔ (۹۔۷۸۰)۔

یہی نہیں۔ انگلیوں کے پوروں کے علاوہ انسان کے ہتھیلیوں اور پنجوں
ایسے بے شمار مبہم سے نشانات اور دھاریاں ہوتی ہیں جن کے مقاصد خداوند ع

کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔ اگرچہ علم دست شناسی Palmistry جس کی بنیادیں
محض طویل تجربات اور تحقیقات پر قائم ہیں اس سلسلے میں بڑی حد تک ہماری رہبری
کرتے ہیں۔ اور اس کے بڑے مشہور دانشور اور علماء گزر چکے ہیں جن میں کیرو کا نام سرفہرست
آتا ہے۔ ہاتھ کی لکیریں بنتی اور بگڑتی بھی دیکھی گئی ہیں اور اس سلسلے میں کیرو کا ایک
چشم دید واقعہ قابل ذکر ہے۔ اس نے ایک شناسا کا ہاتھ دیکھ کر بتلایا تھا کہ وہ پچھتر
سال زندہ رہے گا مگر جلد ہی اس کی اچانک ایکسیڈنٹل موت ہوگئی اور جب
کیرو نے دوبارہ اس کی ہتھیلی دیکھی تو وہ حیرت زدہ ہو کر رہ گیا۔ اس کی زندگی کی
لکیر پینتالیس سال کے قریب کٹ کر ٹیڑھی پڑ چکی تھی۔

یہی نہیں انگلیوں اور ہتھیلیوں کے نشانات کے علاوہ پنجوں۔ کلائیوں جبینوں
پر بے شمار لکیریں اور نشانات ایسے بھی ہوتے ہیں جو بنتے اور بگڑتے رہتے ہیں۔ جن
کے متعلق قرآن حکیم میں آیا ہے کہ۔

"اور یہ وقت مقررہ کے لئے ایک تحریری حکم ہے۔ اللہ جسے چاہتا ہے محو کر
دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے قائم کر دیتا ہے۔ اصلی کتاب تو اسی کے پاس ہے (۱۳۔۳۹)

"جو کچھ یہ بکتا ہے۔ ہم اسے لکھ لیتے ہیں اور اس کے لیے اور بھی بڑھا دیتے ہیں (۱۹۔۸)

"جن لوگوں نے توبہ کر لی اور (اپنی خرابیوں کی) اصلاح کر لی تو البتہ خدا بڑا
بخشنے والا۔ سننے والا اور مہربان ہے"۔ (۳۔۸۹)

قرآن حکیم کے مندرجہ بالا آیات سے اس بات کی بھی وضاحت ہو جاتی ہے کہ اگر
انسان اپنے کئے ہوئے ماضی کے گناہوں پر اڑا رہے اور لگاتار گناہ پر گناہ کرتا چلا
جائے۔ اور کبھی نادم بھی نہ ہو تو اس کے گناہوں میں اضافہ ہی ہوتا رہتا ہے۔ یہی نہیں

بلکہ ان کی عقوبتیں اور بھی بڑھ جاتی ہیں۔ اسی طرح اگر کوئی گنہگار اپنے کیے ہوئے گناہوں پر نادم ہوتا ہے اور صدق دل سے توبہ کرکے اعمال نیک کرنا شروع کر دیتا ہے۔ تو وہ خداوند رحیم وکریم بڑا توبہ کا قبول کرنے والا اور گناہوں کا مٹانے والا بھی ہے۔

"خدا تو یہ چاہتا ہے کہ وہ تمہاری توبہ قبول کرلے اور جو لوگ خواہشات کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں وہ یہ چاہتے ہیں کہ تم لوگ سیدھے حق سے بہت دور ہٹ جاؤ۔ خدا چاہتا ہے کہ تم سے (بارگناہ) میں تخفیف کر دے۔ کیونکہ آدمی تو کمزور پیدا ہی کیا گیا ہے۔" (۴. ۲۸)

ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جس وقت انسان اپنے کئے ہوئے گناہوں سے صدقِ دل سے توبہ کر لیتا ہے اور نیک اعمال کرنا شروع کر دیتا ہے تو یہی نہیں کہ وہ رحیم وکریم پروردگار صرف اس کے پچھلے گناہوں کو ہی معاف کر دے بلکہ انہیں مٹا کر ان کی جگہ پر نیکیاں ثبت کر دیتا ہے اور اس کے کئے ہوئے ماضی کے گناہوں کو بھی نیکیوں میں بدل دیتا ہے۔ بالکل اس ٹیپ ریکارڈر کی طرح جس میں پچھلی باتیں مٹا کر دوسری نئی باتیں دوبارہ لکھی جا سکتی ہیں یا جیسے ہتھیلیوں یا اور دوسرے اعضاء جسمانی کی بنتی بگڑتی۔ اور مٹ کر دوبارہ بنتی ہوئی لکیریں۔!!

"سوائے اس کے جو توبہ کرے۔ مومن ہو جائے اور نیک عمل کرنا شروع کر دے۔ وہ بس وہی ہیں جن کی بدیوں کو خداوند کریم نیکیوں میں بدل دے گا اور اللہ تو بڑا بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔" (۲۵. ۷۰)

روز محشر اعمال کے سچے گواہوں کا تذکرہ قرآن حکیم میں مختلف مقامات پر مختلف انداز اور عنوان سے آیا ہے۔ جن میں نظام عدلِ الٰہی کے تحت مجرمین اور ظالمین کے

خلاف گواہیاں دنیاوی عدالتوں کی گواہیوں سے کچھ مختلف ہی نظر آتی ہیں۔ ایک جگہ ارشاد ہو رہا ہے کہ۔

"جس دن دلوں کے بھید جانچے جائیں گے تو (اس دن) ان کا کچھ زور نہ چلے گا اور نہ (ان کا) کوئی مددگار ہی ہوگا۔" (۸۹. ۹ تا ۱۰)۔

اس آیت سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ثواب یا عقاب کسی کے محض نیک و بد اعمال پر ہی منحصر نہ ہوگا بلکہ عاقبت میں ان کی نیتوں اور ارادوں تک کی کیفیات جانچی جائیں گی اور ان کے باطنی جذبات اور نیتوں کی گواہیاں بھی پیش ہوں گی۔ اور اس سلسلے میں یہ بندوں کے باطنی اعمال و احساسات کے ردعمل ہی ہوں گے جنہیں وہ قادرِ مطلق اپنے قدرت باکمال اور علم بے مثال سے کچھ اس طریقہ اور انداز سے سامنے لاسکے گا جس کا نہ تو ہم اس دنیا میں ادراک ہی کر سکتے ہیں اور اُن طریقوں کی اس دنیا کی جانچ یا تفتیش سے کوئی موازنہ ہی کر سکتے ہیں۔

یہ ایک عالمی حقیقت ہے کہ انسان کا کوئی بھی فعل ہو۔ خواہ وہ اعمال خیر ہوں یا اعمال شر انسان کے وجود پر انتہائی گہرا اثر چھوڑتے ہیں۔ یہ بات ہر انسان جانتا ہے کہ ظلم و جبر۔ فتنہ و فساد پسندیدہ افعال نہیں ہو سکتے لیکن وہ اپنی نفسانی خواہشات اور دنیا طلبی کے غلبہ میں آکر ان کا ارتکاب کرتا ہے مگر اس کے باطن میں ان ناپسندیدہ افعال کے خلاف ایک ہنگامہ شروع ہو جاتا ہے اور اس کے یہی احساسات اس کے ضمیر میں کہیں محفوظ ہو جاتے ہیں اور پھر یہی باطنی جذبات ضمیر کی گہرائیوں سے ابھر کر عدالت الٰہیہ کے سامنے اپنے جرائم کا اقرار کریں گے۔ بغض و حسد۔ تعصب اور رشک انسان کے ضمیر کو جلا ڈالتا ہے اور اس حقیقت کو جانتے ہوئے بھی انسان

ان کا مرتکب ہوتا رہتا ہے۔ اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے امام جعفر صادقؑ نے فرمایا ہے کہ "جس طرح چھری گوشت کے اندر پیوست ہوتی چلی جاتی ہے۔ برائی اس سے کہیں زیادہ انسان کے اندر اثر کرتی ہے"۔ (البحار)

ان سارے حقائق کے پیش نظر یقین کیجئے کہ ہمارے اعمال اور افعال خود ہمارے اجسام میں ذخیرہ ایک پر ایک قوی اور مستقل تحریر کی طرح ہمارے ضمیروں میں محفوظ ہوتے ہیں اور پھر روز محشر کسی بھی صورت میں خواہ باطن کی آوازوں کی شکلوں میں۔ خواہ ہیولوں کی شکلوں میں یا مجسّم ہوکر ہمارے سامنے آسکیں گے۔ اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ محکمہ عدالت الٰہیہ کی تحقیق و تفتیش انتہائی ٹھوس اور حق بین ہوگی جس کی مثال کسی دنیاوی عدالت یا دنیاوی تحقیق و تفتیش سے نہیں دی جاسکتی۔ یہ ایسی عدالت ہوگی جس کے سامنے نہ تو کوئی اپنے اعمال بد کا انکار کرسکے گا اور نہ اس سلسلے میں کسی طرح کی بحث یا تکرار کی گنجائش ہوگی۔ کیونکہ عمل کا فنا ہوجانا اور ضمیروں سے احساسات کا معدوم ہوجانا ممکن نہیں ہے۔ اور اسی حقیقت کی طرف قرآن حکیم نے اشارہ کرتے ہوئے بتلا دیا ہے کہ۔

"تم لوگ خدا کی نشانیوں کا کیوں انکار کرتے ہو۔ حالانکہ خدا خود تمہارے اعمال کا شاہد ہے"۔ (۳۔۹۷)۔ اسی طرح خداوند کریم نے اعمال کے گواہوں میں پیغمبران صالحین اور اماد طاہرین کا بھی ذکر کیا ہے۔

"اور (روز محشر) زمین اپنے پروردگار کے نور سے جگمگا اٹھے گی اور اعمال کی کتاب (لوگوں کے سامنے) رکھ دی جائے گی اور پیغمبروں اور گواہ حاضر کئے جائیں گے اور ان میں انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیا جائے گا اور ان پر ذرہ برابر بھی ظلم نہیں

کیا جائے گا"۔ (۳۹-۶۸)۔

اس سلسلے میں جیسا کہ پہلے ذکر کیا جاچکا ہے یہ گواہیاں محض انسان کے ظاہری اعمال و افعال تک ہی محدود نہ ہوں گی بلکہ ان کے باطنی احساسات۔ جذبات اور کیفیات۔ صدق عمل، موقعہ عمل۔ محل عمل۔ جذبات عمل اور خلوص عمل کا بھی جائزہ لیا جاسکے گا جن کی گواہ ہوں گی وہ محترم اور مافوق ہستیاں جو انسان کے دلوں کے بھید تک سے واقف ہیں اور جو صالحین اور غیر صالحین۔ مومنین اور منافقین۔ اہل ایمان اور ریاکاروں میں امتیاز کرسکے گی۔ اور ایسے گواہ وہی محترم اور معصوم ہستیاں ہوسکتی ہیں جن کے ظاہر و باطن طیّب اور طاہر اور معصوم ہوں۔ اور انہیں کی طرف قرآن اشارہ کر رہا ہے۔

"اے رسولؐ کہہ دیجئے کہ تم لوگ اپنے اپنے کام کئے جاؤ۔ ابھی تو خدا اور اس کا رسول اور مومنین تمہارے کاموں کو دیکھیں گے۔ اور بہت جلد (روز محشر) ظاہر و باطن کے جاننے والے (خدا) کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ تب جو کچھ بھی تم کرتے تھے تمہیں بتلا دیا جائے گا"۔ (۹۔۱۰۵)۔

روز محشر سے متعلق ایک مہمل سی وضع کی ہوئی حدیث کا ذکر کرنا بھی انتہائی اہم اور ضروری ہوگا۔ حدیث کچھ اس طرح ہے کہ "حضرت عائشہ نے فرمایا کہ میں نے آنحضرتؐ سے سنا کہ قیامت کے روز (روز محشر) لوگ ننگے اٹھائے جائیں گے۔ وہ ننگے پاؤں اور بے ختنہ ہوں گے۔ میں نے کہا یا رسولؐ اللہ کیا مرد، عورت سب ننگے ہوں گے اور ایک دوسرے کو دیکھتے ہوں گے (اگر ایسا ہوا تو بڑے شرم کا مقام ہوگا)۔ اس کے جواب میں آنحضرتؐ نے فرمایا کہ اے عائشہ روز محشر کی سختی اس قدر ہوگی کہ لوگ گھبراہٹ اور پریشانی [illegible] کو دوسرے کی طرف دیکھنے

کا دھیان ہی نہ ہوگا۔" یا پھر اسی طرح کی دوسری وضع کی ہوئی حدیث بھی ہے کہ "حضرت رسول نے ارشاد فرمایا ہے کہ قیامت کے روز تم لوگ ننگے بدن۔ ننگے پاؤں اور بے ختنہ جمع کیے جاؤ گے" اور یہ فرما کر قرآن مجید کی آیت تلاوت فرمائی" جس طرح اوّل بار پیدا کرنے کی ابتدا کی۔ اس کو دوبارہ اسی طرح لوٹائیں گے" یعنی خالق اس بات پر قادر ہے کہ تم کو ہو بہو ٹھیک ٹھیک انھیں اعضاء و جوارہ کے ساتھ اسی طرح پیدا کردے جس طرح اس نے پہلی بار پیدا کیا تھا اور تمہارے تمام اعضاء و جوارہ میں کوئی خامی یا کمی نہیں ہوگی۔ اور یہاں تک کہ تمہاری انگلیوں کے پور پور جو جسد انسانی کے سب سے باریک اور اہم نشانات مانے جاتے ہیں وہ بھی بالکل پہلے جیسے ہی ہوں گے جس طرح تمہاری پہلی پیدائش کے وقت تھے۔

اس سلسلے میں اگر کسی حدیث گڑھنے والے نے ایک ایسی مضحکہ خیز حدیث ایجاد کر دی جس کی بنیادوں پر اس سے بھی مضحکہ خیز منظر پیش کیا جا سکتا ہے کہ جس طرح خدا نے پہلی بار تم کو ایک برہنہ۔ ننگے پیر اور غیر مختون بچہ پیدا کیا تھا اسی طرح ایک نوزائندہ بچے کی طرح دوبارہ پیدا کرے گا۔ لیجئے صاحب پھر تو دنیاوی اعمال نیک و بد۔ گناہ ثواب۔ نامۂ اعمال۔ خیر و شر۔ پوچھ گچھ۔ دھر پکڑ۔ جنّت دوزخ کا قصہ ہی ختم ہو جاتا ہے۔ پھر تو ہر طرح کا خدشہ ہی تمام ہو جاتا ہے۔ اور پھر تو ہر طرف میدان حشر میں نوزائندہ بچوں کی چیخ پکار۔ رونے اور کلکاریاں مارنے کی آوازیں ہی سنائی دیں گی اور چاروں طرف بچے ہی بچے۔ اچکتے۔ ھمکتے اور۔ ہاتھ پیر مارتے نظر آئیں گے۔ اور اس طرح وہ میدان حشر نہ ہو کر نوزائندہ بچوں کا ایک عظیم نمائش گاہ بن جائے گا!!

اسی سے ملتی جلتی قرآن حکیم کی ایک دوسری آیت پیش کرنے کی جراءت کر رہا ہوں۔ جس پر چند قابل تحسین مفسرین حضرات نے طبع آزمائی فرمائی ہے۔

"آخر تم ہمارے پاس تنہا آئے (اسی طرح) جس طرح تم کو پہلی بار پیدا کیا تھا۔" (۶۔ ۹۵)۔

اس سلسلے میں کچھ حضرات نے "فرادیٰ" کے معنیٰ برہنہ کے لئے ہیں جب کہ فرادیٰ کے لغوی معنیٰ "الگ الگ" یا تنہا کے ہوتے ہیں۔ فرادیٰ فرد کی جمع ہے جس کے معنی طاق۔ تنہا اور اکیلے کے ہوتے ہیں۔ اس آیت کو مکمل پڑھ لینے کے بعد مطلب واضح ہو جاتا ہے کہ۔ "اور تم ہمارے پاس اسی طرح تنہا آئے جس طرح ہم نے تم کو پہلی بار پیدا کیا تھا اور جو مال و متاع تم نے جمع کیا تھا وہ سب اپنے پیچھے چھوڑ آئے اور ہم تمہارے ساتھ تمہارے اُن سفارشیوں کو بھی نہیں دیکھتے جن کی نسبت تم خیال کرتے تھے کہ وہ تمہارے سفارشی ہیں۔ آپس کے سارے تعلقات منقطع ہو گئے۔ وہ جو وعدے کیا کرتے تھے سب جاتے رہے۔" (۶۔ ۹۵)۔

اس پوری آیت میں کسی جگہ اور کسی طرح بھی برہنہ محشور ہونے کا تصوّر نہیں ابھرتا۔ اور مقصد انتہائی واضح اور عیاں ہے کہ انسان جس طرح تنہا پیدا ہوا ہے اسی طرح اپنے اعمال نامہ کے ساتھ محشور ہوگا جہاں اس کے دنیاوی رشتے۔ ناتے۔ دوست احباب۔ مال و متاع۔ شریک کار اور سفارشی کوئی بھی ساتھ نہ ہوں گے یا پھر اس کی بہترین تفسیر تو یہی ہو سکتی ہے کہ تم تنہا ہی آ گئے اور حسب ہدایت رسُول اور آل رسُول کا وسیلہ ساتھ نہ لائے۔

خداوند کریم کے صفاتی ناموں میں ایک نام "ستّار" بھی ہے۔ جس کے معنی ہوتے

"ستر پوشی" اور "پردہ پوشی" کرنے والا۔ کیا کوئی بندہ خواہ وہ کتنا ہی گنہ گار کیوں نہ ہو اس ستّار و غفّار سے اس بات کی امید کر سکتا ہے۔ وہ خالق مطلق جس نے ہمیں دنیا میں ستر پوشی کا اور عورتیں چھپانے کا خصوصی حکم دیا ہے یہاں تک کہ اگر بندہ اس بات پر قادر نہ ہو کہ لباس فراہم کر سکے تو درخت کے پتّوں سے اپنی پردہ پوشی کرے اور اگر سر دست یہ بھی ممکن نہ ہو سکے تو کیچڑ مٹی ہی لپیٹ کر اپنی شرمگاہوں کو چھپا لے۔ ان ہدایات کے پیش نظر کیا کوئی سوچ بھی سکتا ہے کہ وہ اپنے بندوں کو اس مخصوص دن ایسی شرمناک حالت میں محشور کرے گا۔ تصور کیجئے ان بندوں میں صالحین بھی ہوں گے۔ متقی اور پرہیز گار بھی ہوں گے۔ خدا کے مطیع اور عبادت گزار بھی ہوں گے۔ شہداء اور مقرب بارگاہِ پروردگار بھی ہوں گے۔ ان میں ایسے مخلص بندے بھی ہوں گے جنہیں دنیا میں کبھی کسی نے برہنہ تو کیا کبھی رفعِ حاجت کرتے بھی نہ دیکھا ہوگا۔ ان میں مرد بھی ہوں گے۔ عورتیں بھی ہوں گی۔ ذرہ انصاف کیجئے کہ سارے کے سارے میدان حشر میں مادرزاد برہنہ اُس ستّار و غفّار کے سامنے کھڑے کئے جائیں گے۔!! استغفر اللہ۔ کیا مضحکہ خیز منظر پیش کیا ہے۔ کیا کہنا ان مفسّرین کا جن کی تفسیرات کے سامنے شیطان بھی مارے شرم کے سر جھکا لے۔!! اسی سلسلے میں یوم محشر کا منظر بھی قرآن حکیم کی زبان میں پیش کرنا ضروری ہوگا

"اس دن (روز محشر) سے ڈرو جس دن کچھ چہرے نورانی ہوں گے اور کچھ لوگوں کے چہرے سیاہ" (۳۔ ۱۰۶)۔

"اور اس دن (روز محشر) جن کے چہروں پر نور برستا ہوگا وہ تو خدا کی رحمت میں ہوں گے۔" (۳۔ ۱۰۷)

"اُس دن (روز محشر) بہت سے چہرے نورانی ہوں گے۔ خنداں اور شاداں" (۸۰۔ ۳۸)

"اُس دن (روز محشر) پرہیزگاروں کو (خدائے رحمٰن) اپنے سامنے مہمانوں کی طرح جمع کرے گا۔" (۱۹۔ ۸۶)

"جس دن (روز محشر) تم مومن مردوں اور مومن عورتوں کو دیکھو گے کہ ان کا نور ان کے آگے آگے اور ان کے داہنے ہاتھ دوڑ رہا ہوگا۔ ان سے کہا جائے گا کہ آج تمہارے لئے خوشخبری ہے۔" (۵۷۔ ۱۲)

اب ان آیات قرآن کے پیش نظر ذرہ اس مہمل اور رکیک حدیث کا نقشہ بھی ذہن میں کھینچئے اور پھر اس حدیث گڑھنے والے کرم فرماؤں پر یا تو دل کھول کر رو لیجئے یا پھر جی بھر کے ہنس لیجئے۔!!

کلام اللہ تو کہہ رہا ہے کہ اس دن بہت سے چہرے خنداں اور شاداں ہوں گے۔ خدا اس دن اپنے پسندیدہ اور برگزیدہ بندوں کو اپنے سامنے مہمانوں کی طرح جمع کرے گا۔ ان کے چہرے نورانی ہوں گے۔ ایک نور ان کے آگے آگے اور دوسرا نور ان کے داہنے جانب ان کے ساتھ چل رہا ہوگا۔ ذرہ غور فرمائیں کیسی مضحکہ خیز عکاسی کی گئی ہے ان اللہ کے مہمانوں کی جن کے اوپر نیچے۔ آگے پیچھے۔ دائیں بائیں ہر جانب سے نور کی بارش ہو رہی ہوگی۔ ان کے چہرے بھی نورانی ہوں گے مگر ہوں گے غریب مادرزاد برہنہ۔ یہ مومنین کے ساتھ ستم ظریفی نہیں تو اور کیا ہے۔!! بھلا ایسے میں بھی خداوند ستّار و غفّار کے مہمان وہ مومن مرد اور مومن عورتیں خنداں اور شاداں دکھلائی دے سکیں گے۔! وہ صف محشر ہوگی یا ان کرم فرماؤں کے مطابق بہروپیوں کا ایک بدترین اور ناپسندید مظاہرہ۔!! ایک ایسا مظاہرہ جسے دنیا کی کوئی بھی

مہذّب قوم گوارہ نہیں کرسکتی۔

جس دن (روزِ محشر) خداوند کریم نبی کو اور ان لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں رسوا نہ کرے گا۔" (۶۶-۸)۔

ایسے حدیث ساز حضرات کم ازکم اس آیت کریمہ سے ہی اپنی جہل کی تاریکیوں میں جھانک سکتے کہ بھلا ان اللہ کے مومن بندوں کے لئے "مادر زاد" برہنہ محشور کئے جانے سے بڑھ کر بھی کوئی رسوائی ہوسکتی ہے۔!

خدا مجھے اس بے باکی کے لئے معاف فرمائے۔ کاش اُن تاریک ذہنوں نے اس حدیث کو وضع کرنے سے اس کی چھان بین کی ہوتی اور رسولؐ اور ان کے اہلبیت کی مستند اور معتبر احادیث سے رہبری حاصل کی ہوتی تو یوں گمراہ کن حدیثیں نہ وضع کرتے اور نہ قبول کرتے۔!!

"کافی" میں امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے کہ "اپنی اموات کو کفن اچھے دو کیوں کہ تم سب اپنے کفنوں میں مبعوث کئے جاؤ گے۔" اور اسی حقیقت کی طرف امام محمد باقرؑ نے اشارہ کرتے ہوئے خبر دی ہے کہ "جس شخص کو اس دن نور میسّر آیا اس نے ضرور نجات پائی اور مومن ایک بھی ایسا نہ ہوگا جسے اس دن نور میسّر نہ آئے۔"

ساحل ابن سہیل کہتے ہیں کہ میں نے امام جعفر صادقؑ کو یہ کہتے سُنا ہے کہ "مومنین کے اعمالوں کا نور (حشر) کے روز مومنین کے آگے آگے اور ان کے داہنے ہاتھ دوڑتا ہوگا۔ یہاں تک کہ وہ سب جنّت میں اپنے مکانوں میں جا اتریں گے۔"

میں اس عنوان کو اپنے ان دعائیہ جملوں کے ساتھ ختم کرتا ہوں کہ اے مالک کائنات

تو ہم سب کو صراط مستقیم پر قائم رکھ۔ ہمیں راہ باطل سے بچاتے ہوئے راہ حق اور صراط مستقیم پر قائم رکھ۔ ہمیں اپنی پسندیدہ توفیقات عطا فرماتا رہ اے خالق کائنات۔ اے ربّ العالمین تو تمام مومنین اور مومنات کو رسولؐ اور آل رسولؐ کے صدقہ میں نجات دے۔ اے ہمارے پروردگار ہم سب گنہگار اور خطا کار ہیں۔ ہم سب تیرے انصاف کی نہیں تیرے کرم کے امیدوار ہیں۔!!

روزِ محشر اعمال کا وجود

دور ماضی میں جب علم انسانی اپنے ابتدائی منزلوں پر ہی تھا اور موجودہ دور کی طرح ارتقائی منزلوں کو طے نہیں کر پایا تھا اس وقت لوگوں کا خیال تھا کہ مادّہ اور طاقت دو الگ الگ چیزیں ہیں اور ان کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں ہے مگر ذہن انسانی کی مسلسل کاوشوں اور تجربات نے آج اس بات کو ثابت کر دیا ہے کہ مادّہ کو طاقت میں بدلا جا سکتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ آج کے مفکر، دانشور اور محقق تو اس بات پر بھی غور کر رہے ہیں کہ طاقت کو دوبارہ مادّہ میں تبدیل ہو جانے کے امکانات ہیں اور وہ دن دور نہیں جب علم انسانی ان منزلوں کو پا سکے گا۔ اور طاقت کو دوبارہ مادہ میں تبدیل کیا جا سکے گا۔

غور کرنے کے بعد تو بہر حال آج بھی یہ بات ذہن میں آجاتی ہے کہ منتشر طاقتوں کو دوبارہ یکجا اور اکٹھا کیا جا سکتا ہے جس سے انکار کی کوئی بھی دلیل نظر نہیں آتی۔ یہ بات بھی واضح ہے کہ انسانی افعال خواہ وہ اعمال خیر ہو یا اعمال شر یہ سب جسم کے اندر ذخیرہ ہیں اور کسی طاقت کے تحت ان کا اظہار ہوتا رہتا ہے۔ اور یہ طاقتیں جب تک انسان زندہ رہتا ہے اس کے جسم میں ذخیرہ رہتی ہیں اور ہر فعل کے عمل میں آنے کے ساتھ خارج ہوتی رہتی ہیں۔ یہ طاقت خواہ آواز کی شکل میں باہر آئے۔ خواہ حرکت و عمل کی صورت میں ظاہر ہو خواہ کسی میکانیکی انداز میں خارج ہو۔ یہ ایک ایسی طاقت ہے جو ہر انسان کے جسم میں موجود ہے اور جس ماخذ غذاؤں اور مشروبات کی

شکلوں میں استعمال کئے گئے مادّے ہی ہوتے ہیں۔ انھیں استعمال شدہ مادّوں سے انسانی جسم میں ایک برقی طاقت پیدا ہوتی ہے جو جسد انسانی میں ذخیرہ ہوتی رہتی ہے اور جن کا اخراج کبھی ظلم و جبر کی صورت میں تو کبھی احسان سندی اور رحم و کرم بن کر تو کبھی انصاف کی ترازو کی شکلوں میں سامنے آتا رہتا ہے۔ یہ نظریہ اس بات کی دلیل ہے کہ مادّہ طاقت میں تبدیل ہوتا رہتا ہے۔

یہی نہیں بلکہ سائنس نے تو یہ بھی ثابت کر دیا ہے کہ انسان کے نیک و بد خیالات اس کے جذبات۔ اس کے خوف و خدشات جو ذہن میں بیدار ہوتے ہیں ان کا لگاتار قائم رہنا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ تصوّرات اور احساسات کہیں ذہن کے تہہ خانوں میں زندہ اور پائندہ رہتے اور وقت وقت پر اور موقعہ موقعہ پر ذہن کے تہہ خانوں سے ان کا اخراج ہوتا رہتا ہے۔ یہ حسّی طاقتیں اخراج کے وقت عامل کے چہروں۔ قیافوں اور جبینوں پر بھی پڑھی جا سکتی ہیں اور ان کا مشاہدہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ یہ اعمال علمی اور میکانیکی انداز میں ظاہر بھی ہوتے ہیں اور اگر اس کے یہ جذبات محض احساسات کی سطح تک آکر رک بھی گئے اور اس سے آگے نہیں بڑھے پھر بھی ان کے تاثرات کبھی غصّہ۔ کبھی مطلوبیت کبھی چہرے کی رنگت۔ کبھی غصّہ کی سرخی۔ آنکھوں کی رنگت۔ جبینوں کے تیور سے یا پھر صدق و احسان کے مطمئن اور پُرسکون احساسات اگرچہ ذہن انسانی سے عملاً باہر نہیں آتے پھر بھی ان عظیم طاقتوں کا اثر اور ان کا ردعمل قوائے انسانی پر ہونا لازمی ہوتا ہے جو کبھی دوران خون کی تیزی یا کمی کی صورت میں تو کبھی اختلاج قلب۔ یا دوسری قلبی یا ذہنی امراض کی شکلوں میں۔ کبھی اس کے اندرونی غدود کے مضطرب ہو جانے کی شکلوں میں ظاہر ہوتے ہیں۔

یہی نہیں بلکہ ہمارے وہ سارے کے سارے نیک و بَد تخیلات۔ مغموم و مسرور احساسات۔ سینوں میں دبے ہوئے جذبات۔ دلوں میں پوشیدہ ارادے خواہ ان کا اخراج ہو یا نہ ہو مگر ان کا ردِّعمل کائنات کی فضاؤں میں برقی لہریں اور ارتعاش ضرور پیدا کرتا ہے۔ ان اندرونی جذبات کا ہیجان اپنا مخصوص نسبتی ارتعاش اور مختلف لہریں پیدا کرتا ہے جو اپنے مخصوص رنگ اور مخصوص سرعت FREQUENCY کے ساتھ اپنا دائمی اور مستقل ریکارڈ فضائے کائنات میں چھوڑتا رہتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہمارے نیک و بَد احساسات۔ تصوّرات اور جذبات خواہ عملی شکلوں میں ظاہر نہ بھی ہوں پھر بھی ان کے اثرات کا ارتعاش لہروں کی شکلوں میں اپنے خصوصی شناختوں اور سرعتوں کی شکلوں میں فضائے کائنات میں ذخیرہ ہوتے رہتے ہیں جو نہ تو کبھی مٹتے ہیں اور نہ فنا ہوتے ہیں اور اس طرح ہمارے محض خیالی اور جذباتی تاثرات تک اپنا ایک مستقل اثر کائنات کے اس فضائی بھنڈار میں ذخیرہ کرتے رہتے ہیں اس طرح ہمارے نیک و بَد جذبات اور احساسات تک ایک کبھی نہ مٹنے والے ریکارڈوں ہیں جو قدرت کے محافظ خانوں میں اکٹھا ہوتے رہتے ہیں جو کبھی مستقبل میں ان امانتوں کو صاحبانِ امانت تک پہنچانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ یہ مستقل ریکارڈ قانونِ فطرت کے تحت فضاؤں میں بلند ہوتے رہتے ہیں۔ اُوپر۔ اور اُوپر اور یہاں تک کہ روزِ محشر وہ ساری توانائیوں کے ساتھ ہمارے سامنے حاضر ہو کر ہمارے نیک و بَد اعمال کے مظہر ہوں گے۔!! اور پھر یہ سب دل میں چھپے ہوئے جذبات اور پوشیدہ ارادوں تک کی گواہی دیں گے۔ قرآن حکیم نے انھیں حقائق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے۔

"اس کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں۔ جن کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا... کوئی پتہ نہیں

جھڑتا مگر وہ اسکو جانتا ہے۔" (۶.۵۹)۔

"وہ پوشیدہ اور ظاہر کا جاننے والا ہے۔ وہی دانا اور خبردار ہے۔" (۶.۷۳)۔

"کیا ان کو معلوم نہیں کہ خدا ان کے بھیدوں اور مشوروں تک سے واقف ہے اور یہ کہ وہ غیب کی باتوں کا جاننے والا ہے۔" (۹.۷۸)۔

"وہ تو دلوں کے بھید تک سے واقف ہے۔" (۳۵.۳۸)۔

اس طرح ہمارے اعمال اور افعال جنہیں چاہے ہم بھول جائیں یا جنہیں ہم ناپسند ہی کیوں نہ کریں وہ ہمارے علم کے بغیر ہی قدرت کے محافظ خانوں میں محفوظ ہیں جو ایک وقتِ معین پر یا تو ہمیں ابدی سعادت یا ابدی شقاوت کا سزاوار بنا دیں گے۔

ہم نے مانا کہ آج ہمارا علم محدود ہے۔ تحقیق و دریافت محدود ہے۔ حصولِ نتائج کے ذرائع محدود ہیں مگر اس تیز رفتار سائنسی اور علمی ترقی کے دور میں ناممکن نہیں ہے کہ آنے والے وقتوں میں ہم پر اس کا انکشاف نہ ہو سکے۔ موجودہ دور میں بھی ہم ترقی کی ان منزلوں تک تو بہرحال پہنچ ہی چکے ہیں کہ مدّتوں پہلے کے بزرگوں اور دانشوروں کی آوازیں ٹیپ کر لینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ آج ہم نے یہ بھی معلوم کر لیا ہے کہ موجودہ انسانوں کے اعمال اور افعال کائنات کی فضاؤں میں ایسا ارتعاش اور ایسی لہریں پیدا کرتے ہیں جو پانی کی لہروں کی طرح ایک کے بعد ایک آگے بڑھتی چلی جاتی ہیں۔

دور پارینہ کے گھڑوں میں جمع شدہ آوازوں کو دوبارہ لوٹایا جا رہا ہے۔ آج کے طاقتور نیوکلیائی دوربینوں کی مدد سے ماہرینِ علمِ افلاکیات اور سیارگان دور دراز کہکشاؤں سے آنے والی روشنی کی لہروں۔ رنگت اور ان کے انعکاس سے ان کی دوری

جسامت۔ ماحول اور فضاؤں کا اندازہ لگا لینے میں کامیاب ہو چکے ہیں اور قدرت کے بہت سے رازِ سربستہ معلوم کر چکے ہیں تو پھر کیا ہم اس بات سے انکار کر سکتے ہیں جب خود انسان کے اعمال اور افکار جو لہروں کی شکلوں میں فضائے کائنات میں غیر مرئی شکلوں میں قائم ہیں ایسے آلات کی مدد سے دوبارہ بنائے جا سکیں گے جو قدرت کے کارخانوں میں موجود ہیں اور پھر اس طرح طاقت سے دوبارہ مادّہ کی شکل میں آ جانے سے انکار نہیں کیا جا سکتا اسی طرح اس بات سے بھی کون انکار کر سکتا ہے کہ روزِ محشر ہمارے اعمال مجسّم ہو کر ہمارے سامنے عرض کیے جا سکیں گے۔

آج ہم ٹیلی ویژن پر کئے جانے والے پروگراموں، رونما ہونے والے حادثات اور واقعات کو ہزاروں میل کی دوری پر بھی دیکھ سکتے ہیں تو جب اس نظامِ قدرت میں جس کی ہر چیز مربوط اور ایک دوسرے سے متعلق اور منسلک ہے اور ادوار اور زمانوں سے وابستہ ہونے کے ساتھ ہی ساتھ گردشِ لیل و نہار سے بھی متاثر ہے اور جو آخر کار سورج کی گردشِ پیہم پر قائم ہے کیا ہم اس بات سے انکار کر سکتے ہیں کہ اگر ہم کسی ذریعے سے اس نظامِ شمسی کے دوسرے سیاروں تک پہنچنے میں کامیاب ہو سکیں تو جو حادثات یا واقعات ہماری اس دنیا میں بہت زمانہ قبل ہو چکے ہیں انھیں دوسرے سیاروں میں ہزاروں سال بعد بھی دیکھ سکتے ہیں۔ مگر اس کے لئے ایک ایسی سرعتِ رفتار کی ضرورت ہو گی جو گردشِ لیل و نہار سے بھی تیز ہو۔ اور ساتھ ہی ساتھ ہمارا تحفظ بھی شرط ہے۔ جو فی الحال محض قیاسی ہی ہو گا۔

آج کے موجودہ علم نے یہ بات بھی ثابت کر دکھائی ہے کہ دور دراز واقع سیارے جنھیں ہم آج بھی روشن دیکھ رہے ہیں صدیوں پہلے ختم ہو چکے ہیں مگر یہ ان کا فاصلہ ہی ہے کہ ان کی

روشنی کا تسلسل ہمارے ساتھ اب تک قائم ہے۔

اسی طرح زمانہ کے نسبتی ہونے کے سبب سے انسان اپنا آج کا کیا ہوا عمل مدتوں بعد مستقبل میں بھی دیکھ سکے گا کہ اس نے ماضی میں کیا کیا تھا چونکہ اس دنیاوی زندگی میں نہ تو انسان کا ذہن اس قدر قوی اور وسیع ہوتا ہے اور نہ اس کے حواس اس دنیا میں کئے گئے اپنے اعمال کا کوئی ریکارڈ ہی مرتب کر پاتے ہیں۔ اسی لئے وہ ان کے مثبت اور منفی نتائج اور انجام سے بے خبر رہ کر دنیاوی عیش پرستی میں مبتلا رہتے ہیں۔ لیکن روزِ محشر ان کا ہر ریکارڈ اور ہر عمل ان کے سامنے کھول کر رکھ دیا جائے گا۔ اس وقت ان پر ہر چیز منکشف ہو جائے گی۔ اس حقیقت کو قرآن حکیم نے مندرجہ ذیل آیت میں بیان کیا ہے۔

"بلکہ جو (بداعمالیاں) پہلے سے چھپاتے تھے آج (اس) کی حقیقت ان پر واضح ہو گئی"

(۶: ۲۸)

ان سارے حقائق سے باخبر رہ کر زندگی گزارنے والا مثالی انسان وہی ہے جو ہر حال میں خدا پر توکل اور بھروسہ رکھے۔ اس کی یاد میں مشغول ہو جائے۔ ہر رنج مصیبت کے وقت صبر کا دامن تھامے رہے اور اس قدر مضبوطی کے ساتھ قائم رہے کہ پھر اسے دنیاوی خلفشار اور الجھنیں متزلزل نہ کر سکیں۔

کیونکہ اس کے لئے ایسے بڑے سے بڑا دور سے گزرنا پڑ سکتا ہے۔ قرآن حکیم میں بھی مومنوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ

"مومنو! مصیبت کے وقت صبر اور نماز کے ذریعے سے اللہ کی مدد لیا کرو بیشک خدا صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے" (۲: ۱۵۳) اگر ان خیالات اور جذبات اور ناپسندیدہ افکار تمہارے ذہنوں میں ذخیرہ نہ ہو سکیں۔ تمہارے اعمال

صالح اور پسندیدہ ہوں۔

تمہارے جذبات فرحت بخش اور روح افزا ہوں۔ تمہارے بیرونی اعمال اور داخلی افکار خوش آئند اور خوش کُن ہوں۔ اور ان تمام اعمال پسندیدہ اور افعال رخشندہ کی معراج ہے اپنے نفس پر قابو پالینا دنیا میں کامیاب اور کامران زندگی گزارنے کے لئے حضرت علیؑ کے مندرجہ ذیل ہدایات پر عمل کرتے ہوئے ہر شخص اپنی زندگی کامیاب بنا سکتا ہے۔

(۱) ہر شخص کے اندر دو طاقتیں ہوتی ہیں ایک عقل اور دوسری نفس. جب انسان کی عقل نفس پر غالب آگئی تو وہ فرشتوں سے بہتر اور جس کی نفس اس کے عقل پر غالب آگئی وہ حیوانوں سے بدتر ہو جاتا ہے۔

(۲) جب اپنے دشمن پر قابو پا جاؤ تو اس کو معاف کر کے اس نعمت کا شکر ادا کرو۔

(۳) بڑے گناہوں کے کفارہ میں مصیبت زدوں کی فریاد رسی اور مبتلائے رنج کی تکلیف کو دور کر دینا ہے۔

(۴) کوئی شخص ایسا نہیں ہے جو دل کی کوئی بات چھپائے اور وہ اس کی زبان کی اتفاقی گفتگو اور چہرہ کے اتار چڑھاؤ سے ظاہر نہ ہو جائے۔

(۵) دنیا ایک راستہ ہے ٹھہرنے کی جگہ نہیں۔ اس میں دو طرح کے آدمی ہیں۔ ایک وہ شخص جس نے اپنے نفس کو بیچ دیا تو دنیا نے اسے تباہ کر دیا۔ اور ایک نے اپنا نفس اُس سے خرید لیا تو دنیا نے اُسے آزاد کر دیا۔

(۶) صابر کامیابی ضائع نہیں کرتا چاہے کتنا ہی زمانہ گزر جائے۔

(۷) جس نے دنیا سے دل لگایا اُسے تین چیزیں لگ جائیں گی (۱) مسلسل غم (۲) لگاتار

لالچ (۳) ناکام آرزوئیں۔

(۸) بہترین عمل وہ ہے جس پر تم اپنے نفس کو مجبور کرو۔

(۹) جسم کی تندرستی حسد کی کمی پر ہے۔ (حسد آدمی کو پگھلا دیتا ہے)۔

قرآن حکیم نے دنیا میں کامیاب و کامران رہنے کے بڑے حکیمانہ طریقے تعلیم کئے ہیں "یہی وہ لوگ ہیں جنہیں ان کے اعمال خیر کی دوہری جزا دی جائے گی. چونکہ انھوں نے صبر کیا اور بدی کا بدلہ (دفیعہ) نیکی سے کیا کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انھیں عطا کیا ہے اس میں سے ہماری راہ میں بھی خرچ کرتے رہتے ہیں۔ اور جب کسی سے کوئی بُری بات سُن لی تو اس سے کنارہ کش رہتے ہیں اور صاف کہہ دیتے ہیں کہ ہمارے واسطے ہماری کارگزاریاں اور تمہارے واسطے تمہاری کارستانیاں" (۲۸-۵۴، ۵۵)۔ اور اس طرح تعلیمات قرآن اور فرامین معصومین پر عمل کرتے ہوئے انسان ان ناپسندیدہ محرکات سے بچ سکتا ہے. جن کے تاثرات لہروں کی شکلوں میں فضائے کائنات میں معدوم نہ ہو کر ابدلآباد تک باقی رہتے ہیں۔ یہ بھی فضائیں ہستی اور فطرت کے محافظ خانوں میں محفوظ رہتے ہیں۔ علمی اعتبار سے یہ ایک ایسا پختہ اور لازوال قدرتی ذخیرہ ہے جو انسان کے تمام مثبت اور منفی اعمال و افکار کو قائم و دایم رکھتا ہے اور کبھی مستقبل میں موافق اور مناسب حالات میں فطرت یہ سب امانتیں صاحب امانت کو لوٹا دینے کی صلاحیت رکھتا ہے!!

فطرت کے محافظ خانوں میں ذخیرہ شدہ یہ انسانی اعمال خیر و شر کی طاقتیں ایک نئی شکل میں ظاہر ہوں گی اور دوبارہ مادی شکلوں میں ظاہر ہو کر میدان حشر میں فائل کے خلاف یا موافق گواہیاں دیں گی جن سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اسے

علم بتلا رہا ہے اور اب سائنس نے بھی ثابت کر دیا ہے۔ کہ انسان کے اندر یہ ذخیرہ شدہ طاقتیں کبھی رحم و کرم کبھی اصلاحی اور تعمیری تو کبھی ظلم و جبر کی شکلوں میں خارج ہوتی رہتی ہیں، جو اعضاء جسمانی کی نقل و حرکت یا تاثرات سے بھی ظاہر ہوتی ہیں اور فطرت کے عظیم خزانۂ کائنات میں باقی رہتی ہیں اور پھر اس بات پر تعجب نہ کیجئے کہ یہ ساری مقناطیسی یا برقی لہریں ایک دن ثواب عظیم یا عذاب علیم کی شکلوں میں فائل کو دوبارہ لوٹا دی جاسکتی ہیں اور پھر اس دن وہ ان فطری حقائق اور غیر مشکوک گواہوں کو نہ تو جھٹلا سکے گا اور نہ ان کا انکار ہی کر سکے گا۔ اور اس طرح انسان اپنے اعمال کا بوجھ خود اٹھائے ہوئے ہوگا جس کا وہ خود ذمہ دار ہوگا۔ قرآن حکیم نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

"ہر شخص اپنے اعمال کے بدلہ میں گروہ ہے" (۵۲۔۲۱) اور کہا ہے کہ ہم نے ہر انسان کا نامۂ اعمال اس کے گلے کا ہار بنا دیا ہے۔ اور روز محشر ہم اسے اس کے سامنے کھول کر رکھ دیں جیسے وہ اپنے سامنے ایک کھلی ہوئی کتاب پائے گا۔ ہم اس سے کہیں گے کہ اپنا نامۂ اعمال پڑھ لے "آج اپنا حساب لینے کے لئے تو خود ہی کافی ہے" (۱۷۔۱۴)۔

امام جعفر صادقؑ سے اس کتاب کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا کہ انسان کو اس کے تمام اعمال یاد دلائے جائیں گے گویا اس نے انھیں اسی وقت کیا ہے۔ اس لئے گنہگار کہیں گے کہ ہائے افسوس یہ کیسی کتاب ہے۔ اس نے تو چھوٹے بڑے کسی عمل کو چھوڑا ہی نہیں ہے۔ اس روایت سے یہ بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ کوئی دنیاوی کتاب جیسی نہ ہوگی جس کو انسان شروع سے لے کر آخیر تک پڑھ لے گا بلکہ اس ریکارڈ کی اور اس کے پڑھنے کی کیفیت بھی مادی دنیا کے طریقوں سے الگ ہوگی بلکہ اسکے

اعمال و افکار یا تو خود اس کے اندر اور یا پھر محافظ خانۂ فطرت میں محفوظ ہیں جن کا اس سے محاسبہ کیا جائے گا اور قرآن حکیم نے انھیں حقیقتوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔

"ہم یقیناً مردوں کو زندہ کرتے ہیں اور جو کچھ وہ پہلے کر چکے ہیں (اچھی یا بری بات) ان کی نشانیوں کو لکھتے جاتے ہیں" (۳۶۔۱۲)۔

میں رسولؐ کی مندرجہ ذیل حدیث کے ساتھ جو اس عنوان کی ایک اہم کڑی ہوگی اس عنوان کو ختم کرتا ہوں۔!!

- قیس بن عاصم کا بیان ہے کہ میں کافی دور سے آئے ہوئے ایک وفد کے ساتھ بارگاہ رسالت میں حاضر ہوا۔ میں نے عرض کی کہ "حضور ہم بہت دور صحرا کے رہنے والے ہیں۔ ہمارا شہر آنا بہت کم ہوتا ہے اس لئے اس فرصت کو غنیمت سمجھ کر آپ سے کچھ نصیحت حاصل کرنا چاہتے ہیں"۔ حضورؐ نے فرمایا۔ "اے قیس۔ عزت کے ساتھ ذلت ہے اور یقیناً زندگی کے ساتھ موت ہے۔ ہر عمل کا حساب ہوگا اور ہر چیز پر نگران موجود ہے۔ ہر نیکی کا ثواب اور ہر گناہ کی سزا ہے اور اے قیس سنو۔ تمہارے ساتھ تمہارے ایک ہم نشین کا ہر وقت ہونا ضروری ہے جو زندہ ہوگا اس حالت میں کہ تم مُردہ ہوگے۔ اگر وہ ہم نشین کریم ہے تو تم پر کرم کرے گا اور اگر لئیم ہے تو تمہیں مصائب کے حوالہ کر دے گا۔ پھر اس کا حشر بھی تمہارے ساتھ ہی ہوگا اور روز محشر تم بھی اس کے ساتھ اٹھائے جاؤ گے۔ تم سے صرف اسی بارے میں پوچھا جائے گا لہٰذا تم اس کو صالح قرار دو۔ اگر وہ صالح ہے تو تم اس سے مانوس ہوگے اور اگر غیر صالح ہے تو تم اس سے متوحش ہوگے۔ اور وہ تمہارے اعمال ہیں"۔

اعمال کے میزان

روز محشر ہمارے اعمال جن میزانوں پر تولے جائیں گے۔ ان کا تصوّر نہ تو ہم اس دنیا میں کر سکتے ہیں اور نہ ان کا ادراک کر لینا ہمارے لئے ممکن ہے۔ کیونکہ ایسی کوئی چیز نہ تو ہم نے اس دنیا میں کہیں دیکھی ہے اور نہ ایسا کوئی تجربہ ہی کیا ہے۔ اس کے بعد اگر ہم اُس ترازو کا اپنے ذہن میں کوئی نقشہ بنائیں بھی تو وہ مہمل اور بے معنی ہی ہوگا۔ اس لئے اگر ہم یہ سوچنے لگیں کہ اس دنیا کی طرح وہاں پر بھی ترازو ہوگی۔ باٹ ہوں گے۔ اعمال کا کوئی ڈھیر ہوگا جو اس ترازو پر تولے جائیں گے یا دنیاوی معاملات کی طرح وہاں پر بھی ہمارے اعمال کے متعلق تفتیش اور تحقیق ہوگی اور احکام صادر کئے جائیں گے تو یہ سب درست نہیں ہوگا۔

اس سلسلے میں سوچنے سے پہلے یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ یہ اُس عالم کی بات ہے جو ہماری دنیا سے بالکل جُداگانہ اور الگ ہے۔ اور وہاں کے حالات کا ہم اپنی دنیا سے کوئی نہ تو موازنہ کر سکتے ہیں اور نہ کوئی تمثیل پیش کر سکتے ہیں۔ ہاں اگر وہاں کی میزان اور طرز میزان کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے تو وہ محض ارشادات قرآن حکیم یا تعلیمات معصومین سے ہی ممکن ہو سکتا ہے۔ میزان کے سلسلے میں قرآن حکیم میں آیا ہے۔

"اسی نے آسمان بلند کئے۔ اور ترازو قائم کی"۔ (۵۵۔۷) یا

"اور روز محشر تو ہم انصاف کے ترازو قائم کر دیں گے۔ پھر کسی شخص پر کچھ بھی ظلم نہ کیا جائے گا اور اگر رائی کے دانے کے برابر بھی کسی کا عمل ہوگا تو ہم اسے لا کر حاضر

کریں گے اور ہم حساب کرنے کے واسطے بہت کافی ہیں"۔ (۲۱۔۴۷)۔

غور فرمائیں کہ موجودہ ترقی کے دور میں ایسے ایسے میزان اور آلات ایجاد ہو چکے ہیں۔ جن سے ہوا کا دباؤ۔ جسم کی حرارت۔ دوران خون اور بجلی کی لہروں وغیرہ کی مقدار معلوم کی جا سکتی ہے اور آج ایسی مشینیں بھی ایجاد ہو چکی ہیں جن سے آدمی کے سچے اور جھوٹے بیانات کی بھی تصدیق ہو جاتی ہے تو کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ کل ایسے آلات بھی بنائے جا سکیں جن سے نیتوں کی کیفیت۔ کئے گئے اعمال کی نیت اور جذبات کی حقیقت کا اندازہ لگایا جا سکے۔ اور پھر یہ قبول کر لینا بھی دشوار نہیں ہوگا کہ اگر ہم ابھی اپنے تحقیقی دور میں یہاں تک پہنچ پائے ہیں تو عالم آخرت میں تو اس خالق مطلق اور خالقِ علم و عقل کے یہاں ایسے آلات کا قائم کیا جانا خلاف عقل نہیں ہے اور ایسے سارے آلات اور میزانیں وہاں موجود ہوں گی اور بروئے کار لائی جائیں گی۔

عالم عقبیٰ میں روز محشر اس طرح کے دقیق۔ باریک بین اور حسّاس آلات موجود ہوں گے جن سے روحانی۔ نفسانی اور جذباتی احساسات اور کیفیتوں تک کو تولا جا سکے گا۔ یہی نہیں بلکہ انسان کے اعمال خیر و شر کے مقاصد۔ جذبات کی پاکیزگی۔ عقاید کی بلندی اور مضبوطی۔ بے نیازی۔ بے لوسی اور احساسات خوشنودیٔ خدا اور حقیقی مقاصد کا بھی صحیح اور واضح اندازہ لگایا جا سکے۔ اسی طرح بداعمالیوں کی قباحت۔ انتہائے ظلم و جبر۔ اپنے معبود کی طرف سے لاتعلقی اور خودسری جیسے منکر جذبات ان کی انتہائے ذلالت کو اسکے عشر عشیر تک معلوم کیا جا سکے گا۔ اور اس طرح اس دنیا میں نہ تو ہم اُن میزانوں اور پیمانوں کا کوئی اندازہ ہی لگا سکتے ہیں اور نہ ان کا ادراک ہی کر سکتے ہیں۔

میدان حشر کے متعلق پوچھے جانے پر امام جعفر صادقؑ نے فرمایا ہے کہ موازین سے مُراد انبیاء اور صالحین کے کردار اور ان کی مثالی زندگیاں ہیں۔ یہی حضرات انسانیت میں کامل ہیں۔ اس روایت سے یہ بات سامنے آجاتی ہے انھیں حضرات کی مثالی زندگیاں ہیں جن کی بنیادوں پر ہمارے اعمال اور ایمان کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ کہ ہمارے اندر کس جگہ اور کہاں پر اور کس حد تک کمی ہے اور محرومی ہے۔ انھیں صالحین اور متقین کے فضائل اور کمالات کو سامنے رکھ کر ہم اپنا معیارِ عمل قائم کرسکتے ہیں اور اس سلسلے میں جو حقیقتیں آج مہمل لگ رہی ہیں وہ سب روزِ محشر واضح ہوجائیں گی۔

عمل کے سلسلے میں یہ بھی واضح کردینا ضروری ہوگا کہ محض عمل ہی سب کچھ نہیں ہے بلکہ معیارِ عمل کے لئے نیت عمل خلوص عمل۔ ان کا موقعہ اور محل بھی انتہائی اہم اور ضروری ہے۔ عدالت الٰہیہ میں نیتوں، ضمیروں اور اغراض کو بھی جانچا اور پرکھا جائے گا۔ وہ عمل جو قربتاً الا اللہ سے خالی اور محض دکھاوے اور ریاکاری کے لئے ہو وہ محض معاشرہ کی نگاہوں میں تو محترم ہوسکتا ہے مگر بارگاہ خدا میں وہ عمل درجۂ مقبولیت تک پہنچ سکتا۔ اور آخرت میں اس کی کوئی قیمت نہیں ہوسکتی۔ اور ایسا عمل ایک جسم بے روح سے زیادہ نہیں ہوگا۔ کیونکہ ایسے شخص نے اپنا دین دنیا کے ہاتھوں فروخت کردیا ہے۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہوتا ہے کہ۔

"تاکہ تمھیں آزمائے کہ تم میں سے کام میں سب سے اچھا کون ہے"۔ (۲.۶۷)۔

اس سلسلے میں امام جعفر صادقؑ نے فرمایا ہے کہ "اس سے زیادہ عمل کرنا مُراد نہیں ہے بلکہ صحیح عمل کرنا مُراد ہے"۔ عمل خالص ہو۔ خوشنودیٔ خدا کے لئے ہو اور قربتاً الا اللہ ہو۔ انسان کا ایمان اور اعتقاد خدا پر جس قدر قوی ہوگا اس کے اعمال بھی اسی قدر

قوی ہوں گے۔ کیونکہ ایسے اعمال میں خلوص ہوگا اور اس کی ہر خواہش پر خوشنودیٔ خدا کی شرط ہوگی۔

آخیر میں مولائے کائنات کی اس مناجات کے ساتھ اس عنوان کو تمام کرتا ہوں۔

"میرے پروردگار میں تجھ سے تیرے حق کا واسطہ دے کر اور تجھ سے تیری قدوسیت کا واسطہ دے کر تیری بڑی سے بڑی صفت اور بڑے سے بڑے نام کا واسطہ دے کر سوال کرتا ہوں کہ میرے رات اور دن کے اوقات اپنی یاد سے بھرپور کردے۔ اپنی خدمت میں لگے رہنے کی دُھن لگا دے اور میرے اعمال کو اپنے حضور میں قبول فرما۔ تاکہ میرے کُل اعمال اور میرے کُل وظائف کی ایک ہی ورد ہو جائے اور مجھے تیری خدمت کرنے میں دوام حاصل ہوجائے"۔ (نہج البلاغتہ)۔

یہ ثواب اور عذاب دائمی کیوں؟

حیات بعد از موت کے سلسلے کا یہ انتہائی اہم اور غور طلب مسئلہ ہے۔ کہ عاقبت میں نافذ کی جانے والی سزائیں عنایت کئے جانے والے انعامات اور جزائیں دائمی کیوں۔ !انسانی زندگی خواہ وہ کتنی ہی طوالانی کیوں نہ ہو اس کی کوئی حد ضرور ہوگی ڈھائی سو سال۔۔ ڈھائی ہزار سال یا ڈھائی لاکھ سال۔ اور کسی حال میں بھی انسانی زندگی کو دائمی نہیں کہا جاسکتا۔ جب کہ یہ دنیا جس میں ہم رہ رہے ہیں خود فانی ہے۔ پھر اس دنیا میں کئے جانے والے اعمال خواہ وہ نیک ہو یا بد ان کی بھی ایک حد اور مدت ہوگی۔ اور اس طرح اگر کسی نے تاحیات بدی کی۔ ظلم کئے۔ فتنہ و فساد برپا کئے۔ کشت و خون کیا پھر بھی محض اپنی مدت حیات تک ہی اور بس۔ اس طرح اس کے اعمال کی مدت بھی اس کی زندگی کے ساتھ ختم ہو گئی۔ اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ اس محدود مدت تک کئے گئے اپنے کار خیر یا کار شر کے نتیجہ میں وہ دائمی اور ہمیشگی کے عذاب الیم یا ثواب نعیم میں کیوں مبتلا ہوگا! یا دوسرے لفظوں میں دنیا کے محدود اعمال نیک و بد کی عقبیٰ کی لا محدود جزا اور سزا سے کیا نسبت ہو سکتی ہے!!

خدا مالک روز جزا ہے۔ وہ رحمٰن بھی ہے۔ رحیم بھی ہے۔ منصف بھی ہے۔ عادل بھی ہے۔ اور پھر دنیاوی قوانین تو ایسے نہیں ہیں۔ یہاں بھی سزا جرم کے مناسبت سے ہی دی جاتی ہے۔ یہاں تو ہر جرم کی سزا مقرر ہے۔ اگر کسی نے قتل کیا ہے تو پھانسی اور اگر یہی جرم پوری طرح ثابت نہ ہو سکا تو عدالت موت کی سزا کو قید تا

یا پھر اس سے بھی کم دیتی ہے۔ اسی طرح ایک ہی جرم کی کیفیات بھی مختلف ہو سکتی ہیں اور سزائیں بھی ان کیفیات۔ احساسات۔ ماحول اور جذبات کا احساس کر لینے کے بعد ہی دی جاتی ہیں۔

میں نے مانا کہ دنیا میں کئے گئے گناہان عظیم کی سزا عاقبت میں ایک ایسے عذاب الٰہی کا مظہر ہو جو دائمی اور لا محدود مدت تک کے لئے ہو تو اس کے تصور سے ہی دل ڈوبنے لگتا ہے۔ جسم میں لرزہ طاری ہو جاتا ہے! یہ محدود مدت تک کئے گئے گناہان عظیم کی سزا لا محدود مدت تک کے لئے ہی نہیں بلکہ کبھی کبھی تو لمحہ بھر کی لغزش بھی ابدی سزا اور لا محدود عتاب الٰہی بن جاتی ہے۔ اگر چہ یہ اعلانات محض اصلاحی نقطہ نظر سے ہی کیوں نہ ہوں مگر ایک سوالیہ نشان ضرور ہیں۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے یہ حقیقت واضح ہو جانا چاہئے کہ وہ ایوان عدل الٰہی ہے۔ وہاں صرف انصاف ہے۔ وہاں عدل ہے۔ وہاں ذرہ ذرہ کا حساب ہوگا۔ وہاں کسی کا عمل بے جزا نہیں رہے گا۔ وہاں عمل صالح اور عمل غیر صالح کا محاسبہ ہوگا۔ وہاں ذرہ برابر بھی نیکی کا ثواب اور ذرہ برابر بھی بدی کا عذاب ہوگا۔

"تو جس نے ذرہ برابر بھی نیکی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ برابر بھی بدی کی ہوگی وہ اسے دیکھ لے گا" (۹۹-۸) ساتھ ہی ساتھ خدا کی رحمت مومن بندہ کے لئے مخصوص ہے۔ مومن کے لئے وہ رحیم بھی ہے۔ اور ہو سکتا ہے کہ صورتحال پر نظر رکھتے ہوئے اور گنہگار کی ندامت اور پشیمانی پر رحم کرتے ہوئے وہ اسے معاف بھی کر دے اس لئے کہ گنہگار کے احساس پشیمانی اور رعایت الٰہیہ میں گہری مناسبت ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ اصحاب جنت کے محدود زندگی میں کئے گئے اعمال خیر و افعال

صالح کی جزا، دائمی راحتیں اور ہمیشگی کی مسرتیں کس طرح بن سکتی ہیں۔ تو اس سلسلے میں اس حقیقت کو ذہن نشین کر لینا ضروری ہوگا کہ اہل بہشت کی جزاؤں کو اہل دوزخ کی سزاؤں سے منسوب اور ہم آہنگ نہیں کیا جا سکتا۔ دونوں کی بنیادیں الگ الگ دو قسموں کی ہیں۔ سزاؤں کا جزاؤں سے نہ تو کوئی واسطہ ہے اور نہ کوئی رشتہ ہو سکتا ہے۔ ثواب انسانی زندگی کا ایک روشن اور مثبت پہلو ہے۔ جس کی جزا اس کے دینے والے کے فضل و کرم پر منحصر ہے۔ اور ہر کار خیر اور عمل صالح کا موقعہ، محل اور کرنے والے کے جذبات کی بلندی اور اس کا خلوص بھی جزا دینے والے کے پیش نگاہ ہوتا ہے۔ خدا صرف عمل ہی نہیں دیکھتا بلکہ کرنے والے کا جذبۂ عمل، نیت عمل اور موقعہ عمل بھی دیکھتا ہے اور انھیں کے مطابق جزا کے درجات اور منزلیں بھی بڑھتی رہتی ہیں۔ خدا کی یہ سب عنایات اور مومنین پر نوازشیں دائمی اور ہمیشگی کی ہوں گی۔ کیونکہ ایک مومن جو نیک اور مقبول بارگاہ الٰہی عمل کرتا ہے وہ سب اس نیت کے ساتھ کرتا ہے کہ اگر اس کی حیات دائمی ہوتی تو وہ اپنے ان نیک اعمال کو ہمیشہ انجام دیتا رہتا۔ ایک مومن کامل اور متقی بندہ کے اعمال میں نہ تو ریاکاری ہوتی ہے اور نہ محض وقتی اور دنیا کو دکھلانے کا جذبہ۔

اب رہی گنہگاروں کے دائمی عذاب کی بات تو یہ ایک طولانی بحث ہے۔ گنہگاروں پر کئے جانے والے عذاب کے متعلق ارشاد رب العالمین ہے کہ نہ تو اس میں کوئی تخفیف ہوگی اور نہ ایک لمحہ کے لئے کمی کی جائے گی۔ ان پر کیا جانے والا عذاب مسلسل ہوتا رہے گا اگرچہ اس کے دنیاوی گناہ اس کی مدت حیات تک ہی رہی ہو۔ ساتھ ہی ساتھ نہ تو اس نے اپنے ان گناہان کبیرہ اور صغیرہ سے کبھی توبہ کی اور نہ پر کبھی نادم ہی ہوا۔ بلکہ اس کا ارادہ تو یہی تھا کہ اگر وہ ہمیشہ زندہ رہتا تو ہمیشہ اسی طرح گناہ، ظلم، جبر اور فساد کرتا رہتا۔

کچھ حضرات نے قرآن کی ان آیات کی محض دل کے بہلانے والی طفلانہ تسلی کے لئے تاویلیں اس طرح سے کی ہیں کہ ہمیشگی سے صرف مدت دراز مراد ہوتی ہے۔ اس طرح کی تاویلات کر کے شاید وہ خود بھی مطمئن ہو گئے اور دوسروں کو بھی مطمئن کرنے میں کامیاب ہو بیٹھے۔ مگر ایسی تاویلیں نہ تو جائز ہیں اور نہ ہی قابل قبول۔ تاویلیں وہی مناسب ہیں جو آیات قرآن پر کوئی اعتراض نہ کرتی ہوں اور نہ احکام قرآن کے خلاف جاتی ہوں ورنہ غلط تاویلیں ان کے لئے خود گناہ عظیم بن سکتی ہیں۔ قرآن تو انتہائی واضح الفاظ میں کہہ رہا ہے کہ یہ عذاب دائمی ہوں گے اور ہمیشہ کے لئے ہوں جیسا کہ قرآن حکیم میں ارشاد ہو رہا ہے۔

"کیا وہ اتنا بھی نہیں جانتے کہ جو خدا اور رسولؐ کی مخالفت کرتا ہے تو اسی کے لئے دوزخ کی آگ ہے جس میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہے گا اور یہی تو سب سے بڑی رسوائی ہے"۔ (۹۔ ۶۳) یا

"جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اور ہماری نشانیوں کو جھٹلایا یہی لوگ جہنمی ہیں اور ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے"۔ (۲۔ ۳۹)

"اور تم میں جو دین سے پھر جائے اور کفر کی حالت میں مر جائے اس کے تمام دینی اور دنیاوی اعمال اکارت جائیں گے اور یہی لوگ جہنمی ہیں اور ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے"۔ (۲۔ ۲۱۷)

اب کیا اس کے بعد بھی ان آیات کی کوئی صراحت اور وضاحت باقی رہ جاتی ہے!! اور کیا کسی طرح بھی ان ارشادات خداوندی سے انکار کیا جا سکتا ہے! جو ہمیشگی کی دوزخ کا اعلان کر رہی ہیں!!

عذاب کے دائمی اور ہمیشگی کے اعلان میں انسان کے اصلاحی پہلو بھی نمایاں ہیں

اور بندہ خوف عذاب الٰہی کے پیش نگاہ بہت سے جرائم کے ارتکاب سے باز بھی رہ سکتا ہے یا اپنے کئے ہوئے گناہوں سے توبہ بھی کر سکتا ہے۔ یہ اعلان خطرہ کی ایک ایسی گھنٹی ہے جو اکثر انسانوں کو گناہوں سے بچا بھی لیتی ہے۔ وہ اپنے انجام سے باخبر ہو جاتا ہے۔ خدا کے پسندیدہ کاموں کے کرنے اور گناہوں سے پرہیز کرنے کا متمنی بھی ہو جاتا ہے اور اس طرح بُرے اعمال کے بُرے نتائج کا خوف انسان کو ایک بااصول آدمی بنا دیتا ہے۔ وہ اپنے اچھے اور بُرے اعمال کا محاسبہ کرتا ہے اور پھر اپنے نیک اعمال کے ذریعہ سے خدا کی عنایات کی امیدیں بھی لگاتا ہے۔

اسی لئے تو اسلام نے تعلیم دی ہے کہ انسان کو "خوف ورجاء کے مابین زندگی بسر کرنی چاہیئے امام جعفر صادقؑ نے فرمایا ہے کہ "خوف دل کا رقیب ہے اور امید نفس کی شفیع ہے اور جو شخص عارف باللہ ہوگا وہ خدا سے خائف بھی ہوگا اور اُس کا امیدوار بھی ہوگا۔ خوف ورجاء ایمان کے دو بازو ہیں جن کے ذریعہ سے ایک سچا بندہ رحمت الٰہی کی طرف پرواز کرتا ہے۔" آپ فرماتے ہیں کہ "موت کا ذکر نفسانی خواہشات کو مار دیتا ہے۔ غفلت کے سرچشمہ کا قلعہ قمع کر دیتا ہے۔ وعدہ ہائے الٰہی سے دل کو قوت دیتا ہے۔ طبیعت میں نرمی پیدا کرتا ہے۔ خواہشات کے پودوں کو اکھاڑ پھینکتا ہے اور حرص کی آگ کو بجھا دیتا ہے۔" رسولؐ کی اس حدیث کا کہ "ایک گنہہ کی فکر سال بھر کی عبادت سے بہتر ہے۔" کا مطلب بھی یہی ہوتا ہے۔ امام زین العابدینؑ اپنی مناجات میں خدا سے دعا کیا کرتے ہیں کہ "خدایا مجھے ایسی زندگی دے جسے میں تیری عبادت میں صرف کروں اور اگر میری زندگی شیطان کی چراگاہ بننے والی ہو تو اپنی ناراضگی سے پہلے اور میرے اوپر اپنا غضب مستحکم کرنے سے پہلے مجھے موت دے دے۔"

اب رہا یہ کہ چونکہ انسان کا تعلق اس دنیا سے بھی ہوتا ہے جس میں خدا نے ہر طرح کی لذتیں اور سعادتیں بھی فراہم کر رکھی ہیں اور جنہیں حاصل کرنے کی خواہش فطری ہے اور اس کی تمنا ہوتی ہے کہ ان سے لطف اندوز ہو۔ انسان کی خواہشات موت تک باقی رہتی ہیں اس لئے خدا نے پاک و پاکیزہ لذتوں سے لطف اندوز ہونے سے روکا بھی نہیں ہے اور نہ ہی ترک دنیا کی تعلیم دی ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ حکم بھی دیا ہے کہ کہیں دنیا کی چند روزہ لذتیں تمہیں دھوکے میں نہ ڈالیں کہ تم عاقبت کی دائمی لذتوں کو فراموش کر دو اور پھر دنیا کے دھوکے میں آکر آخرت کی دائمی لذتوں سے محروم ہو جاؤ۔

اب ہم انسانی زندگی کے عملی پہلو پر غور کرتے ہیں کہ اس فانی زندگی میں کئے جانے والے اعمال کا صلہ لامحدود اور دائمی کیوں ہوگا

ایک شخص اگر کسی بے دینی یا کسی طرح کی مضر رسم کو شروع کر دیتا ہے یا کسی طرح کی گمراہی کی ابتدا کر دیتا ہے تو اس پر عمل پیرا ہونے والے تو مجرم ہوں گے ہی مگر اس رسم خبیثہ کا موجد جس نے ایک ایسا مذموم طریقہ رائج کر دیا ہے جس کا اثر نہ تو کبھی ختم ہونے والا ہے اور نہ مٹنے والا ہے تو اس کی سزا دائمی اور ہمیشگی کی ہی ہونی چاہیئے جسے نہ تو انصاف سے بعید کہا جا سکتا ہے اور نہ خلاف عدل ہی کہا جا سکتا ہے۔ امام محمد باقرؑ فرماتے ہیں کہ "اگر کسی بندہ نے گمراہی کا راستہ ایجاد کیا جو جتنے اُس راستہ پر چلنے والے ہیں ان سب کے گناہ اُس موجد کے نام لکھے جائیں گے اور گناہ کرنے والوں کے گناہوں میں بھی کمی نہ ہوگی۔"

اسی طرح کسی جُرم کی مدت سزا مدت جرم کے متناسب ہونے کا نظریہ بھی کسی

ذی فہم کے لئے قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ اگر کسی نے کسی کو چھرا مار کر ہلاک کر دینا چاہا تو اس کا یہ جرم تو شاید مشکل سے چند لمحوں کا ہی تھا مگر عمداً قتل کے جرم میں اگر اسے پانچ سال کی قید با مشقت کی سزا ہو جاتی ہے تو کیا یہ سزا دنیاوی قوانین کے لحاظ سے قابل قبول نہیں ہے۔!

قوانین قدرت کے تحت ایسے حادثات آئے دن ہوتے رہتے ہیں اس طرح قدرت کے ضابطوں سے منھ موڑ لینا ہی ایسا نظریہ رکھنے والوں کی بنیادی غلطی ہے۔ فرض کیجئے کہ کسی نوجوان کے ذہن یہ خیال اُبھرا کہ وہ فضا میں پرواز کرے گا۔ اور وہ اپنی اس خواہش کے لئے بلا سوچے سمجھے چھت سے چھلانگ لگا دیتا ہے۔ جس کے نتیجے میں اس کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ جاتی ہے اور وہ تا حیات اپاہج ہو جاتا ہے اور پھر یہ نوجوان نہ تو ساری زندگی بیٹھ سکتا ہے اور نہ چل پھر سکتا ہے اور اس طرح اس کی زندگی ایک عذاب بن جاتی ہے۔ آپ غور فرمائیں کہ اس کی غلطی کی مدت کتنی تھی۔ محض چند لمحوں کی۔ یعنی محض چھت سے زمین تک آنے کی اور نتیجۂ عمل نے اُسے زندگی بھر کے لئے اپاہج بنا دیا۔ اب یہ سزا اُسے بھگتنی ہو گی۔ پچیس سال، پچاس سال، پچہتر سال یا اس سے بھی زیادہ۔ تو پھر قدرت کے قانون میں مدت گناہ (خطا) کی نسبت مدت سزا کیونکر دی جا سکتی ہے۔ ان حقائق سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ عمل گناہ کا ردعمل کس کس طرح سے سامنے آتا ہے اور آ سکتا ہے۔ اور اس حادثہ میں عمل کی مدت اور ردعمل کی مدت میں مساوات کیسے قائم رہ سکتی ہے۔ اجب دنیاوی قوانین بھی اس کے منافی نہیں ہیں۔ جب قانون فطرت میں اس کی واضح مثالیں اور نظریں آئے دن پیش آتی ہیں تو پھر عدالت الٰہیہ ان کے منافی کیسے ہو سکتی ہے۔ اگر وہ نوجوان ہزاروں

سال زندہ رہتا یا اگر اس کی ہمیشگی کی زندگی ہوتی پھر بھی وہ اس عذاب الیم میں ہی مبتلا رہتا۔ اسی طرح وہ انسان جس نے عمداً اعمال بد کئے احکام الٰہی کی نافرمانی کی اور اپنے نفس کو گناہوں میں آلودہ کرتا رہا وہ اپنے اعمال کے نتائج ابدالآباد تک بھگتے گا خواہ وہ اسے پسند کرے یا نہ پسند کرے۔

امام جعفر صادقؑ کی اس حدیث سے جہنمی پر دائمی عذاب کی اور بھی وضاحت ہو جاتی ہے۔ جس میں آپ نے فرمایا ہے کہ "جہنمی کو ہمیشہ جہنم میں رہنے کی وجہ یہ ہے کہ دنیا میں اس کی نیت یہ تھی کہ اگر ہم دنیا میں ہمیشہ رہیں گے تو ہمیشہ ہی ظلم کرتے رہیں گے اور ہمیشہ ہی خدا کی نافرمانی کرتے رہیں گے اور جنتیوں کی ہمیشہ جنت میں رہنے کی وجہ بھی یہی ہو گی کہ ان لوگوں کی نیت یہی تھی کہ اگر ہم ہمیشہ دنیا میں رہیں گے تو ہمیشہ اعمال خیر اور اطاعت پروردگار کرتے رہیں گے۔"

آخیر میں یہ بات واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ دنیاوی نعمتوں سے فائدہ حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ عاقبتی سعادتیں حاصل کرنا بھی قابل قبول ہے بشرطیکہ انسان محض ان مباح نعمتوں سے فائدہ اٹھائے۔ جس سے دوسروں کی کسی طرح سے بھی حق تلفی نہ ہوئی ہو اور انھیں پسندیدہ اعمال اور جائز طریقوں سے ہی حاصل کیا گیا ہو۔ ثواب آخروی سے محروم کر دینے والی چیز دنیا پرستی۔ مفاد پرستی اور لذات دنیا سے اس حد تک ملوث ہو جانا ہے کہ انسان عاقبت سے غافل ہو کر بے لگام ہو جائے اور اپنے حقیقی مقصد سے گمراہ ہو جائے۔ قرآن حکیم نے ایسے لوگوں کو اس سے بھی خبردار کیا ہے کہ "محض دنیا کے پجاری نہ ہو ورنہ یہ تمہیں گمراہ کر دے گی یقیناً وہ لوگ جن کو ہمارے حضور میں آنے کی اُمید نہیں ہے وہ زندگانی دنیا پر راضی ہیں اور وہ لوگ جو ہماری آیتوں سے غافل ہیں۔ ان کے اعمال کی وجہ سے ان کا ٹھکانا جہنم ہے۔" (۱۰۔ ۷ تا ۸)۔

جنّت و نار کا وجود

یہ سوال اکثر اٹھایا جاتا ہے کہ کیا جنّت اور جہنّم کی تخلیق ہو چکی ہے یا خداوند علیم و حکیم انھیں روز محشر خلق کرے گا۔ اس سلسلے میں ایک مکتب فکر کے حکمار کا نظریہ یہ ہے کہ جنّت اور دوزخ ابھی عالم وجود میں نہیں ہیں اور قیامت میں خدا جب اس موجودہ نظام کو ختم کرے گا تو اس کی جگہ پر ایک نیا نظام قائم کرنے کے ساتھ ہی جنّت اور نار کی تخلیق بھی کرے گا۔ مگر یہ نظریہ علم و فہم کے فقدان کی دلالت کرتا ہے۔

اس سے متعلق دوسرے مکتب خیال کے مفکروں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جنّت اور نار خلق ہو چکے ہیں اور وہ آج بھی عالم وجود میں ہیں۔ اور یہی نظریہ صاحبان علم و ادراک کا ہے۔ اس نظریہ کی بنیادیں آیات قرآنی۔ احادیث نبوی کے ساتھ ساتھ جدید علوم دنیاوی کی بنیادوں پر بھی قائم ہے۔ اور ہر نقطۂ نظر سے قابل قبول ہے۔ قرآن حکیم کا ارشاد ہے کہ "اس جہنّم سے بچو جسے کافروں کے لئے مہیا کیا جا چکا ہے۔" (۳۔۱۳۱)

"اسباب مغفرت اور جنّت کی طرف جلدی کرو جس کا ارض آسمانوں اور زمین کے برابر ہے۔" اور جسے پرہیزگاروں کے لئے مہیا گیا گیا ہے۔" (۳۔۱۳۳)

یہ آیات اسبات کی واضح دلیلیں ہیں کہ جنّت اور نار خلق ہو چکے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ احادیث نبوی سے بھی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جنّت اور جہنّم کا وجود ہو چکا ہے۔ اس سلسلے میں رسُولؐ کے واقعات معراج میں اسبات کی بار بار تکرار آئی ہے کہ آنحضرتؐ نے جنّت کی سیر بھی کی اور جہنّم کے خوفناک مناظر بھی دیکھے۔ اور جنّت اور نار پر یقین رکھنا

ایمان بالغیب کی ایک شرط بھی ہے۔

ایک حدیث میں امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے کہ رسُولؐ نے فرمایا کہ جس وقت شب معراج میں آسمان اوّل پر پہنچا تو میں نے جس فرشتہ کو بھی دیکھا وہ خوش و خرّم نظر آیا مگر ایک فرشتہ ایسا بھی دیکھا جس کی شکل و صورت سے غیض و غضب اور ہیبت کے آثار نمایا تھے۔ گو کہ اس نے دوسرے فرشتوں کی طرح میری تعظیم کی لیکن مجھے دیکھ کر نہ تو وہ مسکرایا اور نہ مرحبا کہا۔ میں نے جبریل سے پوچھا کہ جبریل یہ کون فرشتہ ہے جو اس قدر مہیب اور غضبناک نظر آتا ہے۔ تو جبریل نے عرض کی کہ یہ فرشتہ خازن جہنّم ہے اور یہ دشمنان خدا سے ہر وقت غضبناک اور رنجیدہ رہتا ہے۔ پس میں نے اس فرشتہ کو سلام کیا اور اس نے میرے سلام کا جواب دیا اور مجھے جنّت کی خوشخبری دی۔ میں نے جبریل سے کہا کہ اے جبریل خازن جہنّم سے کہو کہ وہ مجھے آتش دوزخ دکھلا دے۔ پس انھوں نے پردہ ہٹا دیا اور جہنّم کے دروازوں میں سے ایک دروازہ کھولا تو اس میں سے آگ کے شعلے اوپر آسمان کی طرف بلند ہوئے اور سارے آسمان پر چھا گئے اور بھڑکنے لگے۔ ہر طرف ایک وحشت سی طاری ہو گئی۔ پس میں نے جبریل سے کہا کہ خازن سے کہو کہ ان شعلوں کو واپس لوٹائے اور جہنّم کا دروازے بند کر کے دوبارہ پردہ ڈالدے۔ پس خازن نے ان شعلوں کو دوبارہ واپس کر کے پردہ حائل کر دیا۔ اور اسی طرح شب معراج کے واقعہ میں بہشت کے نظاروں کا بھی ذکر ہے۔

شب معراج کے تذکرہ میں ہی قرآن حکیم نے بھی جنّت کا ذکر کیا ہے۔

"اور اس (رسولؐ) نے اس فرشتہ (جبریل) کو ایک بار اسکی اصلی صورت میں شب معراج سدرۃ المنتہا کے پاس دیکھا ہے۔ اس کے پاس ہی جنّت الماویٰ ہے۔" (۵۳۔۱۲ تا ۱۵)

کچھ لوگ علمی کم مائیگی اور نافہمی کی وجہ سے جنّت کی دی گئی طول وعرض سے
یا تو یہ استدلال کرتے ہیں کہ جنّت اور نار کا وجود عالم باطل میں نہیں ہے جو ہماری
نظروں سے اوجھل ہیں اور انھیں روز محشر ہی دیکھا جاسکے گا جب ہماری باطن کی نگاہیں
روشن ہوجائیں گی یہ نظریہ موجودہ علمی اور سائنسی دور میں نہ تو قابل قبول ہوسکتا ہے اور
نہ قابل توجہ اور نہ کسی طرح کے دنیاوی یا دینی علوم سے اس نظریہ کی تائید ہی ہوتی ہے۔
میں نے مانا کہ روز محشر ہماری آنکھوں کے سامنے سے پردے ہٹ جائیں گے۔ ہمارے اعمال
وافعال ہماری نگاہوں کے سامنے حاضر ہوں گے لیکن تخلیق جنّت ونار علمی عملی اور تعمیری
حقائق کے لئے ایسا نظریہ قائم کرنا کہاں تک قابل قبول ہوسکتا ہے کہ یہ تو اسی دنیا میں رہ کر
بھی پردۂ غیب میں ہیں اور انھیں محض باطنی نگاہوں سے ہی دیکھا جاسکتا ہے۔ یاد رہے کہ
وہ تخلیقات جن کے لئے علم اور سائنس جواز پیش کرسکے باطن کے پردے ڈالنا مناسب
نہیں ہوگا۔

عالم برزخ کے لئے تو یہ حقیقت قابل تسلیم ہوسکتی ہے کیونکہ یہ مقامات خواہ وہ دنیاوی
بہشت ہوں خواہ دنیاوی جہنم یہ محض روحوں کے لئے جائے قرار ہوسکتے ہیں کیونکہ روح
غیر مادّی ہونے کی وجہ سے عام حالات میں عام انسانوں کو نظر نہیں آسکتی اسی طرح
روحوں کے مسکن بھی مادّی نگاہوں سے پوشیدہ ہیں جو مادّی سرگرمیوں سے بے تعلق اور
الگ تھلگ وادی السلام (نجف اشرف) جیسی جگہ پر موجود ہیں اور یہ ملکوتی مقام مومنین
اور صالحین کی روحوں کے لئے برزخی جنّت ہے۔ اسی طرح وادی برحوط (یمن) جیسی مغضوب
اور ویران جگہ دنیاوی جہنم ہے لیکن آخرت کے دائمی اور ابدی ٹھکانوں کے لئے جہاں
انسان اپنے مادّی جسموں کے ساتھ دائمی زندگیاں گزارے گا وہ بھی موجود اور آراستہ ہیں

بالکل ہماری دنیا کی طرح یا اس دنیا جیسے لاکھوں اور کروڑوں سیاروں کی طرح!
کائنات میں ایسے کروڑوں سیارے ہیں جن کی معلومات ہمیں صفر سے زیادہ کی
نہیں ہے۔ تو کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ انھیں بے شمار اور قیاس میں نہ آنے والے عظیم سیاروں
میں جنت بھی ہو، جہنم بھی ہو۔ ان کے درجات بھی ہوں۔ ان میں وسعتیں بھی ہوں۔ اور کی
گئی وضاحتوں کے مطابق وسیع اور عریض بھی ہوں۔!!!

اس سلسلے میں دوسرا نظریہ رکھنے والوں کا یہ خیال کہ جنّت اور نار کی ابھی تخلیق ہی
نہیں ہوئی ہے اور وہ سب اس دنیا میں اس وقت خلق ہوں گے جب خدا قیامت میں
ایک نیا نظام قائم کرے گا۔ ایسے نظریات رکھنے والوں کے قیاس میں شاید جو کچھ ہے وہ
محض اسی دنیا تک ہی محدود ہے اور بس۔ شاید انھیں اس لامتناہی کائنات کا علم ہی نہیں ہے
جس کے مقابلہ میں ہماری یہ دنیا ایک صفر سے بھی کم حیثیت رکھتی ہے۔ موجودہ علم سائنس
کی تحقیق و دریافت سے نابلد لوگ شاید یہ بھی نہیں جانتے کہ ہماری یہ دنیا خواہ وہ
دیکھنے میں کتنی ہی بڑی کیوں نہ معلوم ہو لیکن ہمارے اس سورج کا رقبہ اس کے مقابلہ میں
اس قدر بڑا ہے کہ اس میں ہماری جیسی تیرہ لاکھ دنیائیں سما سکتی ہیں۔ اور اب تک کی
حاصل شدہ معلومات کے مطابق ہماری ہی نظام شمسی کا سیارہ مشتری JUPITER
کا رقبہ ہماری زمین سے تقریباً ایک سو پچیس گنا بڑا ہے۔ اسی طرح زحل SATURN
کا رقبہ ہماری زمین سے تقریباً اٹھاسی گنا بڑا ہے۔ یورنیس URANUS کا رقبہ ہماری
زمین سے تقریباً سترہ گنا بڑا ہے اور۔ نپچون NEPTUNE کا رقبہ زمین سے تقریباً تیرہ
گنا بڑا ہے۔ اب تک ہم دقیق ترین نیوکلیائی دوربینوں کی مدد سے محض اپنی نظام شمسی
کے چند سیاروں کے رقبہ کے معلومات ہی حاصل کرسکے ہیں اور ہمیں یہ معلوم نہیں ہے کہ

ان عظیم سیاروں میں کیا ہے۔ اور کون سی مخلوق آباد ہے۔ اور اُسی قادرِ مطلق نے ان سیّاروں میں کیا کیا راز سربستہ مخفی کر رکھے ہیں۔ جب کہ اس کا ارشاد ہے کہ میں نے کائنات میں کوئی چیز مہمل اور عبث نہیں پیدا کی ہے۔

یہ تو ہوئی اپنے ہی نظام شمسی کے چند سیّاروں کی ادھوری معلومات۔ پھر کائنات کے اُن آتشیں سمندروں کے لئے کیا کہا جا سکتا ہے جس میں ہمارا یہ عظیم نظر آنے والا سورج ڈال دیا جائے تو ایسا ہی لگے جیسے آگ کے سمندر میں ایک آتشیں گیند گر گئی ہو۔ یا پھر ان عظیم سیاروں کے وسعتوں کا کیا اندازہ لگایا جا سکتا ہے جن کے سامنے ہماری دنیا ایک صفر سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ اور پھر ان سب کے بعد کیا ان سیاروں میں جنّت اور دوزخ کے وجود سے انکار کیا جا سکتا ہے۔!!

علوم افلاکیات اور کائنات میں تلاش و تحقیق کا سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ صدیوں کی کاوشوں کے بعد بھی آج جب کہ ہمارے پاس انتہائی طاقتور دور بینیں بھی ہیں ہم نے اسی قدر معلومات حاصل کی ہیں کہ محض ہماری کہکشاں میں ہی ایک لاکھ سے بھی زیادہ سیّارے ہیں جن میں سے ہم اب تک محض پانچ ہزار سیّاروں کی نشاندھی کر پائے ہیں۔ جب کہ اسی کائنات میں اس طرح کی اربوں اور کھربوں کہکشائیں ہیں۔ پھر ہم جنّت اور دوزخ کے وجو سے کیسے انکار کر سکتے ہیں۔ اسی کائنات میں جنّت بھی ہے۔ جہنّم بھی ہے۔ اور نہ جانے قدرت کی کیا کیا نشانیاں ہیں جنہیں ہم نہیں جانتے۔

اس سلسلے میں یہ حقیقت بھی تمام شکوک و شبہات سے بالاتر ہے کہ ہمارے رسولؐ نے کائنات کی سیر کی۔ اور شبِ معراج خدا کی ان عظیم قدرت کی نشانیوں (جنّت دوزخ) وغیرہ کو دیکھا۔ اور سیر کی۔ اور یہ سب خصوصاً ان کے لئے کیا گیا کیونکہ آپ کائنات

کے رسولؐ ہیں اور یہ آپ کا فرض منصبی تھا کہ آپ اپنے حدودِ رسالت کو دیکھتے اور سیر کرتے۔ سورۂ بنی اسرائیل کے ابتدائی آیت ہی اس حقیقت کا اعلان کر رہی ہے۔

"وہ خدا ہر عیب سے پاک (قابل تعریف ہے) جس نے اپنے بندہ کو راتوں رات مسجد الحرام (خانہ کعبہ) سے مسجد اقصیٰ (بہت دور آسمانی مسجد) تک کی سیر کرائی جس کے چوگرد ہم نے ہر قسم کی برکتیں مہیا کر رکھی ہیں تاکہ ہم اس کو اپنی قدرت کی کچھ نشانیاں دکھلائیں۔" (۱۷-۱)

انسان نوجوان مبعوث ہوگا

روزِ محشر انسان کا اپنے نوجوانی کے بہترین کیفیات کے ساتھ دوبارہ پیدا ہونا ایک ایسی عالمانہ سچائی ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ جو علوم سائنس جدید علوم دین اور احادیث معصومینؑ سے واضح اور ثابت ہے۔

اس سلسلے میں جدید علوم سائنس کے دلائل اس حقیقت کے واضح ثبوت ہیں کہ انسان ایک وقت معینہ پر حالات کے سازگار اور موافق ہو جانے کے بعد دوبارہ اپنی زندگی کے تندرست ترین اور نوجوانی کے بہترین کیفیات کے ساتھ پیدا ہوگا۔ اور یہ علمی نقطۂ نظر سے ممکن ہے۔

علم کیمیات; Chemistry اور علم اعضاء جسمانی; Physiology کے مطابق انسانی جسم کے تمام خلیے چند سالوں میں ایک مرتبہ ضرور بدل جاتے ہیں اور اس طرح انسان کا سارا جسم بتدریج اپنی زندگی میں کئی بار غیر محسوس طریقہ سے بدل جاتا ہے۔ مگر ہر نیا خلیہ اپنے پہلے خلیہ کا نچوڑ۔ وارث اور اس کے تمام خصوصیات کا حامل ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں یہ حقیقت بھی واضح ہے کہ انسان کی عمر کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ اس کے جسم کے تمام ادراکات۔ خصوصیات اور اس کی صلاحیتیں پختہ کاری اور تجربات۔ حصول علم و افکار کے لحاظ سے ہر نئے دور میں ہر نئے خلیے کے ساتھ رو بہ تکمیل و تکامل ہوتے ہیں اور اس کی خصوصیات اور پختگی پہلے خلیے سے بہتر اور رو بہ کمال ہوتی ہیں۔ اس طرح اس کا جسم انتہائی عمر تک پہنچنے کے بعد اور درازئ حیات

حاصل کر لینے کے بعد جب موت سے ہم آغوش ہوتا ہے تو اس وقت وہ اپنے پہلے کے تمام خلیوں کا نچوڑ اور خلاصہ ہوتا ہے۔ یا دوسرے لفظوں میں اس کا وہ آخری جسم پہلے تمام اجسام کا نمائندہ عظیم یا خلیفہ ہوتا ہے۔ اور پھر روزِ محشر حیات بعد از موت حاصل کرتے وقت اس میں ایسی قوت۔ ایسا جوہر اور ایسی حاصل شدہ توانائی ہوگی کہ وہ اپنے پچھلی اور دنیاوی زندگی کے بہترین اور صحت مند ترین خلیوں کے ساتھ دوبارہ پیدا ہو سکے گا۔

اسی طرح دوبارہ نوجوان۔ تندرست ترین۔ اور بہترین قوار کے ساتھ مبعوث ہونے کا جواز علم نباتات; Botany سے بھی فراہم ہو جاتا ہے۔ ایک انتہائی پرانا۔ کہن سال اور خستہ حال درخت خواہ وہ کتنا ہی کمزور۔ کرم خوردہ اور کہن سال کیوں نہ ہو چکا ہو مگر اس کے تخم میں وہی طاقت نمو کارفرماں ہوتی ہے یا یوں کہنا چاہیئے کہ کہن سال درخت کے تخم زیادہ پختہ اور بہترین صفات بالیدگی رکھتے ہیں اور ان کے تخم سے ایک نوجوان۔ بے عیب۔ انتہائی تندرست اور تر و تازہ پودھا نکل آتا ہے اسی طرح انسان جس کی انتہائی مکمل۔ پختہ اور بھرپور صلاحیتیں اس کے تخم لازوال میں پنہاں رہتی ہیں روزِ محشر بیدار ہو کر اپنی بہترین دورِ زندگی کے ایام نوجوانی کی حالت میں دوبارہ پیدا ہو سکے گا۔

علم طبیعیات; Physics کے قوانین کے پیش نظر بھی کائنات کی ہر طاقت داخلی اور خارجی حالات کے زیر اثر ایک دوسری طاقت میں بدلتی رہتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ علم سائنس نے یہ بات واضح کر دی ہے انسان بھی ایک عظیم طاقت کا مرکز و منبع ہے جو اپنی ساری توانائیاں تخم لازوال میں محفوظ رکھتا ہے تخم لازوال جس کی تفصیل انتہائی

مثبت ڈھنگ سے وضاحت کے ساتھ تحریر کی جاچکی ہے اور جس کا علمی جواز علم دین کی روشنی میں "قیامت کا پس منظر کے" تحت پیش کیا جا چکا ہے ایک ایسی خاموش مگر اندرونی طور سے ایک زندہ اور سرگرم عمل طاقت کا مخزن ہے۔ یہی انسانی طاقت کے جوہر کا مخزن اور روز محشر ایک بار تمام موافق اور سازگار حالات کے تحت زبردست ہنگامہ خیزیوں کے ساتھ متغیر ہوکر اپنی پہلی اور بہترین شکلوں میں سے ایک میں دوبارہ پلٹ آئے گا۔ خصوصاً اس دن جب کہ روز محشر تمام طاقتیں۔ قوتیں اور توانائیاں اپنی پہلی حالتوں اور شکلوں میں پلٹ جانے کے لئے آزاد ہوں گی۔

جدید علوم سائنس کی روشنی میں یہ حقیقت واضح ہوجانے کے بعد اب کلام اللہ۔ مستند احادیث اور ارشادات معصومین کی روشنی میں اس حقیقت کا جائزہ لیا جائے۔ جو اس حقیقت کی واضح اور مثبت طریقہ سے رہبری کرتی نظر آتی ہیں۔

قرآن حکیم نے جس طرح مُردوں کے دوبارہ زندہ ہو اٹھنے۔ سڑی گلی اور خاک شدہ اجساد انسانی کے دوبارہ زندہ ہوجانے کی حقیقت بیان کی ہے اسی طرح اہل بہشت کے عین نوجوانی اور نوخیزگی کے عالم کے کیف ونشاط کا بھی ذکر متعدد جگہوں پر کیا ہے۔ اور ایسے کیف انگیز نظارے پیش کئے ہیں جن سے کوئی بھی اہل ایمان انکار نہیں کرسکتا۔

"اہل جنت سرور عیش ونشاط کے مزہ اڑا رہے ہوں گے۔ وہ بھی اور ان کی بیویاں بھی سایوں میں تختوں پر تکیہ لگائے ہوئے۔" (۳۶۔۵۵ تا ۵۶)

"شراب لطیف کا ان میں دور چل رہا ہوگا جو رنگ کی سفید اور پینے والوں کے لئے سراسر لذت ہوگی۔ جس کا لطف پینے والے ہی اٹھائیں گے اور ان کے پاس عورتیں ہوں گی جو نگاہیں نیچی رکھتی ہوں گی۔ اور بڑی بڑی آنکھوں والی (حوریں) اس طرح ہوں گی گویا حفاظت سے رکھے ہوئے انڈے" (۳۷۔۴۶ تا ۴۸)

"سونے کے بنے ہوئے جڑاؤ تختوں پر آمنے سامنے تکیہ لگائے بیٹھے ہوں گے۔ ہمیشہ رہنے والے لڑکے ساغر اور ایسی شراب کا جام لئے ہوئے ان کے پاس آتے جاتے ہوں گے جن سے نہ تو کبھی ان کو درد سر ہوگا اور نہ ان کے خوش وحواس گم ہوں گے۔ اور ایسے پھل لائیں گے جن کو وہ پسند کرلیں۔ اور پرندوں کا گوشت جس کو ان کا جی چاہے۔ اور بڑی بڑی آنکھوں والی حوریں ایسی جیسے چھپے ہوئے موتی۔ جو نیک اعمال وہ کیا کرتے تھے یہ اس کا عوض ہوگا۔" (۵۶۔۱۵ تا ۲۴)

"اہل بہشت اونچے اونچے فرشوں پر ہوں گے اور ان کو حوریں بھی ملیں گی جن کو ہم نے یقیناً بالکل نیا پیدا کیا ہے۔ پھر ہم نے ان کو کنواریاں۔ پیار کرنے والیاں اور ہم نشین خاص کر داہنے ہاتھ والوں کے لئے قرار دیا ہے۔" (۵۶۔۳۴ تا ۳۷)

مندرجہ بالا آیات قرآن سے واضح ہوجاتا ہے کہ اہل بہشت جوان ہی نہیں بلکہ انتہائی نوجوانی کے عالم میں ہوں گے اور ایسے ہی نوجوانوں کے لئے کیف وسرور۔ عالم مستی۔ پاکیزہ شرابوں کا دور اور متعدد بیویاں ہوسکتی ہیں۔ کیا کوئی سوچ بھی سکتا ہے کہ کسی ظعیف العمر کے لئے یا کسی ایسے انسان کے لئے جس نے دنیاوی زندگی کے انتہائی پیرانہ سالی کے دور میں انتقال کیا ہے اپنے اسی ظعف اور لاغری کے ساتھ دوبارہ زندہ ہونے کی حالت میں اس طرح کے کیف وسرور سے لطف اندوز ہوسکتا ہے کوئی انتہائی بوڑھا۔ لاغر اور ظعیف بندہ خدا کی ان نوازسات اور عنایات کا بھلا کیا لطف اٹھا سکتا ہے۔ دنیا میں جب کہ ایک عام نوجوان کے لئے ایک ہی بیوی کافی ہے

زیادہ ہوتی ہے۔ تو ایک کہن سال اور بوڑھے انسان کو بہشت میں بے شمار بیویوں اور حوروں سے حظ اٹھانے اور لطف حاصل کرنے کی بھلا کیا خواہش ہوسکتی ہے۔ جب تک انھیں انتہائی نوجوانی اور تندرستی کے بہترین اعضاء جسمانی کے ساتھ دوبارہ پیدا نہ کیا جائے۔ ساتھ ہی ساتھ قرآن حکیم کے آخری آیات پر خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ جس میں خداوند کریم وحکیم نے فرمایا ہے کہ ان کو کنواریاں ملیں گی جو اہل بہشت کی ہمسن ہوں گی۔ ظاہر ہے کہ کنواریاں اپنی جوانی کے بھرپور دور اور حالت میں ہوں گی اور اسی طرح ان کا ہمسن اہل جنّت بھی بھرپور نوجوان ہی ہوگا۔ جس پر نہ تو کوئی اعتراض کیا جاسکتا ہے اور نہ کسی طرح کا احتمال ہی باقی رہ جاتا ہے۔ اہل جنّت کا جوان ہونا رسولؐ کی اس حدیث سے بھی واضح ہوجاتا ہے کہ جو اسلام کے سبھی فرقوں کے لئے قابل قبول ہے "حسنؑ اور حسینؑ جوانان جنّت کے سردار ہیں۔"

قرآن حکیم نے جس طرح دوبارہ جی اٹھنے کی عملی مثالیں حضرت عزیرؑ اور حضرت ابراہیمؑ کے دور میں پیش کی ہیں جس کا ذکر اس کتاب میں آچکا ہے (قیامت کا پس منظر) اسی طرح قرآن حکیم نے نوجوان ہوجانے کی بھی مثالیں پیش کر کے شکوک اور شبہات کو دور کر دیا ہے۔ اس سلسلے میں جناب زلیخہ کی جوانی کے دوبارہ لوٹ آنے کا واقعہ قابل ذکر ہے۔

تفسیر قمی میں حضرت علی نقیؑ سے منقول ہے کہ "جب سابق عزیز مصر (قطفیر) قحط کے زمانہ میں مر گیا تو اس کی زوجہ مفلس ہوگئی یہاں تک کے بھیک مانگنے لگی۔ لوگوں نے اس سے کہا کہ تو حضرت یوسف کے سامنے کیوں نہیں جاتی۔ وہ بولی کہ حیا مانع ہے۔ جب لوگوں کا اصرار زیادہ ہوا تو وہ ایک دن برسر راہ کھڑی ہوگئی اور جب حضرت یوسفؑ

کی سواری اُدھر سے گزری تو اس کی زبان سے بے ساختہ نکلا "پاک وپاکیزہ ہے وہ خدا جس نے بادشاہوں کو ان کی نافرمانی کی وجہ سے غلام بنادیا اور غلاموں کو فرمابرداری کی وجہ سے بادشاہ"۔ جب حضرت یوسفؑ نے سُنا تو پوچھا کہ "تو ہی زلیخہ ہے"۔ وہ بولی کہ "ہاں"۔ آپ نے پوچھا کہ "تیری کوئی حاجت ہے" تو وہ بولی کہ "اب جب میں بوڑھی ہو گئی ہوں تو مجھ سے میری حاجت پوچھتے ہو"۔ یہ سُن کر حضرت یوسفؑ اسے اپنے محل میں لے آئے اور پوچھا کہ تونے میرے ساتھ ایسا ایسا کیا تو وہ بولی کہ "ہاں۔ مگر اب مجھے ملامت نہ کرو"۔ آپ نے جب وجہ پوچھی تو وہ بولی کہ "ایک تو تم سا حسین جوان خدا نے پیدا ہی نہیں کیا۔ دوسرے مصر میں مجھ سا خوبصورت کوئی نہ تھا۔ تیسرے میرا شوہر نامرد تھا"۔ آپ نے پوچھا "اب کیا ارادہ ہے"۔ تو وہ بولی "خدا سے دعا کرو کہ وہ مجھے پھر سے جوان کر دے"۔ غرض وہ جوان ہوئی اور آپ نے اس سے نکاح کیا تو وہ باکرہ تھی اور اس سے حضرت یوسفؑ کو تین اولادیں بھی ہوئیں ایک "میشا" دوسرے "فراہم" جو حضرت یوشعؑ وصی موسیٰ کے داماد تھے اور تیسری بیٹی "رحیمہ" جو حضرت ایوب کی زوجہ تھیں"۔

(ضمیمہ جات مقبول نوٹ نمبر ۲۔ متعلق ص ۳۹۳)

اسی طرح دوبارہ جوان ہوجانے کا واقعہ "حبابہ والبیہ" نام کی اُس عورت کا بھی ہے جو حضرت علیؑ کے وقت سے لے کر حضرت امام رضاؑ کے دور تک زندہ رہی یہ عورت ائمۂ معصومین کی امامت کے اثبات میں پتھر کے ٹکڑوں پر ان کی مہریں ثبت کرواتی تھی۔ اصول کافی میں ہے کہ یہ عورت ایک دن امام زین العابدینؑ کی خدمت میں آئی اس کے پاس وہ کنکڑی بھی تھی جس پر حضرت علیؑ حضرت امام حسنؑ اور حضرت امام

حسینؑ کی مہریں لگی ہوئی تھیں۔ اس کے آتے ہی امامؑ نے بلا اس کے کہے ہوئے فرمایا کہ وہ کنکڑی لا جس پر میرے اجداد کی امامت کی مہریں لگی ہوئی ہیں میں اس پر مہر لگادوں۔ چنانچہ اس نے وہ پتھر پیش کیا جس پر اپنی مہر امامت لگا کر امام نے واپس کر دی۔ اور اس کی جوانی بھی پلٹا دی۔ جب کہ اس وقت اس کی عمر ایک سو تیرہ (۱۱۳) برس کی ہو چکی تھی۔ "حبابہ والبیہ" کی جوانی آئمہ معصومین کی دعاؤں سے چار بار لوٹ کر آئی اور اس طرح اس نے آٹھ اماموں کا زمانہ دیکھا اور ان کی مہریں لگوائیں۔"

(اصول کافی۔ دمعہ ساکبہ جلد ۲۰ صـ۴۳۶)

تفسیر برہان میں ہے کہ امام محمد باقرؑ نے فرمایا ہے کہ "اہل جنت۔ نوجوان بغیر داڑھی مونچھ کے امرد ہوں گے۔ عیش و عشرت میں مشغول گرامی قدر ہوں گے۔ ایک ایک کو سو سو آدمیوں کے برابر کھانے اور پینے کی طاقت اور شہوت اور جماع کی قوت دی جائے گی۔"

(ضمیمہ مقبول۔ نوٹ نمبر ۵ متعلق صـ۸۹۴)

بد اعمالیوں کی تلافی

انسان کا یہ پیکر خاکی تین چیزوں کا مجموعہ ہے۔ جسد خاکی نفس اور روح۔ انسان کا صرف جسم ہی بیمار نہیں ہوتا بلکہ اس کا نفس اور اس کی روح بھی بیماری کا شکار ہو سکتی ہے۔ جسمانی بیماریوں کا علاج تو ڈاکٹر اور طبیب جراحی۔ آپریشن اور دواؤں سے کرتے ہیں۔ اسی طرح انسان کا نفسانی اور روحانی علاج بھی ممکن ہے اور خدا نے ان کا علاج بھی بندوں کے لئے فراہم کر رکھا ہے۔ اور اس کا بہترین کامیاب ترین علاج دین اسلام نے ہی بتلا دیا ہے۔ روحانی اور نفسانی علاج دین اسلام سے بڑھ کر دنیا کے کسی مذہب میں نہیں مل سکتا۔

دنیا کے بہت سے مذاہب نے اگر روحانیات پر توجہ دی ہے تو انھوں نے جسمانی ضروریات اور جسمانی صحت کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے۔ ایسے مذاہب میں محض روحانی فروغ کر لینا، کمال زندگی اور معراج انسانیت سمجھ لیا گیا ہے۔ ایسے مذاہب کے قائدین اور رہبر و روحانی کمالات اور روحانی حصول کے لئے خود کو ہر طرح کی تکالیف میں ڈالنے اور جسم کو فنا کر دینے کو ہی مقصد زندگی سمجھتے ہیں۔ ان کے مذہبی کتابوں اور بنیادی عقائد میں جسم کی پرورش و پرداخت اور جسمانی صحت پر توجہ دینے کا نہ تو کوئی مقصد ہے اور نہ مقام۔ ان کے نظریہ کے مطابق جب جسم خود ہی مائل بہ زوال ہے تو پھر اس پر توجہ دینے۔ اس کی حفاظت کرنے اور اس کے علاج کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اسے تو جس قدر جلد ہو سکے روحانی حصول کے لئے فنا کر دینا ہی مناسب

اور بہتر ہے۔ ایسے مذاہب میں یہودیت اور نصرانیت کا نام سرِفہرست آتا ہے۔
اسی طرح ایک دوسرا مکتبِ فکر اپنی ساری توجہ محض جسمانی پرورش اور پرداخت پر دیتا ہے اور اس کی ساری توجہ کمانے کھانے اور جسم کو ہر طرح سے تندرست رکھنے پر ہی مرکوز ہے۔ انھوں نے روحانی اور نفسانی ضروریات کو یکسر نظرانداز کردیا ہے۔ ان کے مطابق جو کچھ بھی ہے وہ بس اسی دنیا میں ہے اور ان کا نظریہ زندگی برائے زندگی ہے۔ اور اس طرح ان کی تنظیم میں نفسانی اور روحانی امراض اور ان کا علاج جیسا کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔

دوسری طرف اسلام نے انسان کے جسمانی، نفسانی اور روحانی تینوں مسائل کے پر خاطر خواہ توجہ دی ہے اور ان کے علاج کا انتہائی معقول اور کامیاب ڈھنگ سے اہتمام کیا ہے۔ اسی لئے تو یہ خدا کا پسندیدہ دین ہے "دین اللہ کے نزدیک صرف اسلام ہے"۔ یہی خدا کا پسندیدہ دین ہے کیوں کہ یہی تو دینِ فطرت ہے۔ یہی تو دین، وحدت ہے اور یہی تو دینِ خدا ہے۔

جسمانی امراض سے بچنے کے لئے اسلام نے بہترین اصول وضع کئے ہیں۔ جسمانی امراض غذاؤں کے بے اعتدالی، پُرخوری اور زیادہ طاقتور غذاؤں کے کھانے سے ہی ہوتے ہیں اور بیماریاں غذاؤں کے عدم توازن اور صحت کی طرف سے بے توجہی سے ہی ہوتی ہیں اور اسلام نے غذائی توازن قائم رکھنے کے بہترین اصول وضع کئے ہیں اور ماحول کو صاف رکھنے کی تعلیم دی ہے۔ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا ہے کہ "اپنے معاشرہ کی پراگندہ مت کرو"۔

اسلام نے انسان کے نفسانی عروج کو اولیت دی ہے۔ نفس کے ارتقاء اور

بلندی کا تعلق علم اور ادراک سے براہِ راست ہوتا ہے۔ اسلام نے دولت جمع کر لینے والے اور مالدار انسان کو اس وقت تک کوئی اہمیت نہیں دی جب تک وہ علم و ادراک کی دنیا میں بھی اتنا ہی باکمال نہ ہو۔ اسلام نے جاہل کو ایک جسدِ مُردہ سے زیادہ اہمیت نہیں دی۔ قرآن حکیم نے جگہ جگہ علم حاصل کرنے کی نصیحت کی ہے یہاں تک کہ خدا کا پہلا پیغام بھی "اقرا" سے شروع ہوتا ہے جس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام پڑھنے کا مذہب ہے۔ انسان جس قدر علم حاصل کرے گا اسی قدر وہ جہالتوں مہلات سے دور ہوتا جائے گا۔ اور جس قدر جہالت کی تاریکیاں دور ہوتی جائیں گی اسی قدر اس پر دینِ حق کی راہیں روشن ہوتی جائیں گی اور اسی طرح وہ حقیقی علم و ادراک سے مالامال ہوتا جائے گا۔ اور پھر اسی کے ساتھ اس کا نفس بھی بلند اور پاکیزہ ہوتا جائے گا۔ اسلام میں اگر انسان جسمانی لحاظ سے لاغر ہے تو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔ لیکن اگر وہ علم و ادراک کے نقطۂ نگاہ سے جاہل اور کم مایہ ہے تو یہ اس کا بدترین عیب ہے۔

انسان کی روحانی بلندی بھی اس کے علم و ادراک سے ہی وابستہ ہے۔ ایک صاحبِ علم اور حقائق شناس غور کرے گا کہ اس عالم لامتناہی کے پیچھے ایک زبردست بنانے والے کا ہاتھ ہے۔ اور اس طرح اس کے نفسانی تفکرات کا تعلق براہ راست اس کی روح سے ہوگا۔ ایسے صاحبانِ علم و عقل جب زمین و آسمان اور اس لامتناہی کائنات پر غور کرتے ہیں تو اس کے بنانے والے اور قادرِ مطلق کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتے ہیں اور کہہ اٹھتے ہیں کہ اے میرے خدا تو نے اس کائنات کو بے کار اور عبث نہیں پیدا کیا۔ اور پھر وہ سرنگوں ہو کر اپنی بخشش کی دعائیں کرتے ہیں۔

اسلام میں کمال بشریت علم ہے۔ اسلام میں معراج انسانیت علم ہے۔ جہل نہیں ہے۔ اور یہی علم اس کی نفسانی اور روحانی بیماریوں کا علاج ہے۔!!

اتنا ہی نہیں بلکہ خداوند رحیم وکریم نے انسان کو نفسانی اور روحانی امراض سے نجات حاصل کرنے کے لئے توبہ کا دروازہ بھی کھول رکھا ہے۔ انسان اپنے کئے ہوئے گناہوں کے نتیجے میں بھیانک ترین روحانی اذیتوں میں مبتلا رہتا ہے مگر صدق دل سے توبہ کر لینے کے بعد وہ اس اذیت سے چھٹکارا حاصل کر لیتا ہے۔ اور پھر اس کے بعد وہ اپنی زندگی کو تقوے اور پرہیزگاری کے سہارے پر کامیاب اور کامران بھی بنا سکتا ہے۔

انبیاء معصومین اور آئمہ طاہرین نے گنہگار اور پرُ معصیت زندگیاں گزارنے والوں کو توبہ و استغفار کی ہدایت دی ہے تاکہ ایک گنہگار انسان اپنے کئے ہوئے گناہوں کی لعنت سے چھٹکارہ حاصل کر لینے کے بعد ایک پاک اور پرہیزگار انسان بن سکے۔ وہ اپنے گناہوں کی ذلالت میں آلودہ ہو کر بھی ناامید نہ ہو۔ خدا تو یہ چاہتا ہے کہ اس کے بندوں کے دلوں میں ندامت اور پشیمانی کی ایسی شمع فروزاں ہو جس کی روشنی میں وہ اپنے کئے ہوئے گناہوں کی تاریکیوں میں جھانک سکے جس پر نادم ہو کر خدا سے ان گناہوں کی صدق دل سے معافی کا طلبگار ہو اور ایسے بندوں کی توبہ خدا ضرور قبول کر لیتا ہے۔ اور گناہوں کو معاف کر دیتا ہے۔ خدا تو اپنے گنہگار بندوں کی توبہ اور استغفار سے ایسا خوش ہو جاتا ہے جیسے ایک ریگزار کے مسافر کو رات کی تاریکی میں اس کا کھویا ہوا اونٹ مل جائے۔

خدا کا عذاب تو ایسوں پر ہی نازل ہوتا ہے جو بجائے اپنے کئے ہوئے گناہوں

پر نادم ہونے کے بلا احساس گناہ کے لگاتار گناہ کئے چلے جاتے ہیں یہاں تک کہ اسی حالت میں ان کی موت آ جاتی ہے اور انھیں کبھی پشیمانی نہیں ہوتی ایک مخلص انسان کی اپنے کئے ہوئے گناہوں سے ندامت اور پشیمانی ہی ان کی توبہ ہے۔

مومن اور مخلص بندہ وہی ہے جس کے اندر خوف خدا بھی ہو اور اُس سے اپنے بخشش کی امید بھی ہو۔ اور یہی احساسات خوف ورجاء مومن کی زندگی کو کامیاب اور کامران بناتے ہیں۔ جذبات خوف رجاء کے زیر اثر نہ تو وہ دنیاوی تکالیف اور اذیتوں سے گھبراتا ہے اور نہ لگاتار مصیبتوں سے بیزار ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ خدا سے کبھی اپنی ان تکالیف کا شکوہ نہیں کرتا۔ حالات خوف میں بھی وہ خدا کے پسندیدہ اعمال بجالانے سے غافل نہیں ہوتا۔ اسے ہر وقت اور ہر حال میں محاسبہ کی فکر رہتی ہے۔ وہ گناہوں اور مظالم کی طرف قدم بڑھانے سے تو کیا اس کے تصور سے ہی کانپ اٹھتا ہے۔

احساس خوف ورجاء کے درمیان اپنا توازن قائم رکھنے والا بندہ ہی دونوں جہانوں میں کامیاب و کامران ہوتا ہے۔ ہر وقت خوف خدا اور قہر الٰہی کے تاثرات میں مغلوب اور مجہول انسان نہ تو اپنا مستقبل ہی سنوار سکتا ہے اور نہ اپنی عاقبت ہی تابناک بنا سکتا ہے۔ اسے تو بس خوف خدا اور اپنا تاریک انجام ہی اس قدر متوحش رکھے گا کہ نہ تو وہ توبہ و استغفار کے بارے میں کچھ سوچ سکے گا اور نہ رحمت خداوندی سے فائدہ ہی حاصل کر سکے گا اور انجام کار وہ نامرادیوں اور حرماں نصیبیوں کے ایسے عمیق غار میں جا گرے گا جہاں سے اُسے ابھر پانا ناممکن ہو جائے گا۔ اور اس طرح اس کی روح مُردہ مغموم اور حرماں نصیب ہو جائے گی اور اس کا نخل ایمان

خشک ہو جائے گا۔

جذبات امید و بیم یہودیت اور نصرانیت میں حدود اعتدال سے بہت دور ہیں یہودیوں کے نظریہ کے مطابق خدا قہر و غضب کا مجسمہ ہے جب کہ عیسائیوں کے یہاں خدا کو محض لطف و کرم کا مجسمہ بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ جس کے نتیجے میں ایک فرقہ مایوسیوں کا شکار ہوا اور دوسرا خواب غفلت میں پڑ کر مطمئن ہو گیا یہ اسلام ہی ہے جس نے ان دونوں نظریات کے درمیان ایک متوازن سطح قائم کی ہے۔ جس میں رحمت کے ساتھ عدالت اور عدالت کے ساتھ رحم و کرم کو متوازن رکھا ہے تاکہ بندہ خدا کی رحمت سے ناامید نہ ہو جائے۔ امام محمد باقرؑ نے فرمایا ہے کہ "مومن کے دل میں دو نور ہوتے ہیں ایک نور خوف اور دوسرا نور رجا، اور اس طرح اگر دونوں احساسات کا وزن کیا جائے تو یہ دونوں ہم وزن اتریں گے۔

خدا نے اپنے بندوں کو دعا کا حکم دیا ہے اور اپنی بہت سی عنایتوں اور نوازشوں کو دعاؤں سے وابستہ کیا ہے چنانچہ ارشاد ہے کہ۔

"(اے میرے رسول) جب میرے بندے میرے بارے میں تم سے پوچھیں تو کہدو کہ میں ان کے پاس ہی تو ہوں اور جب کوئی مجھ سے دعا مانگتا ہے تو میں دعا کرنے والے کی دعا کو سنتا ہوں اور دعا قبول کرتا ہوں۔" (۲۔۱۸۶)

"وہ کون ہے۔ جب مضطرب و لاچار اسے پکارے تو وہ سنتا ہے اور دعا قبول کرتا ہے۔ ہر دکھ درد دور کرتا ہے۔" (۲۷۔۶۲)

"تمہارا پروردگار فرماتا ہے کہ مجھ سے دعا مانگو میں تمہاری دعا (مناسب ہوا تو) قبول کروں گا۔" (۴۰۔۶۰)

اسی طرح پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا ہے کہ "دعا مومن کا ہتھیار اور دین کا ستون ہے"

امیر المومنینؑ نے فرمایا ہے کہ "دعا مومن کی سپر ہے۔ جب تم بار بار دروازہ کو کھٹ کھٹاؤ گے تو وہ تمہارے لئے کھول دیا جائے گا۔"

امام زین العابدینؑ کا ارشاد ہے کہ "دعا بلاؤ مصیبت کو ٹال دیتی ہے۔"

امام محمد باقرؑ نے فرمایا ہے کہ "بہترین عبادت دعا ہے۔"

دعا نفسیاتی پہلو سے بھی مفید ہے۔ اس سے پہلا فائدہ تو یہی ہوتا ہے کہ انسان جس قدر اپنے نفسیات پر قابو رکھ سکتا ہے اسی قدر اس کے قوت ارادی میں پختگی پیدا ہوتی ہے۔ عملی زندگی میں وہی ہستیاں کامیاب و بامراد ہوتی ہیں جو اپنے نفس پر مکمل قابو رکھتی ہیں ورنہ کمزور نفس کے انسان تو اپنے متفرق تفکرات کے تانے بانے میں ہی الجھ کر رہ جاتے ہیں اور مقصد حیات کو حاصل کئے بغیر ہی انتہائی حرماں نصیبی کے ساتھ اس دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ اپنے قوت ارادی کو مستحکم کرنے کے لئے انسان کو یقین محکم اور عمل پیہم کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور یہی محرکات انسانی زندگی کو کامیاب بناتے ہیں لیکن ہر شخص میں نہ تو یہ صلاحیت ہوتی ہے۔ نہ عزم مستحکم۔ نہ یقین کامل اور نہ پُر یقین حوصلہ اور ایسے انسان کو ایک ایسے ہتھیار کی ضرورت ہوتی ہے جس کی مدد سے وہ خود کو مضبوط ارادوں اور پُر یقین نتائج کا حامی اور حامل بنا سکے اور وہ ہتھیار ہے اس بندہ کی اپنے خالق سے کامیابی اور کامرانی کے لئے دعا۔ اور اسی دعا کے سہارہ پر وہ اپنا رابطہ ایک ایسے قادر مطلق سے قائم کر لیتا ہے جو اس کی ہر حاجت پوری کر دینے کی قدرت رکھتا ہے اور اس کی ہر مشکل کے حل کرنے پر

قادر ہے۔ اپنی مشکل اور دشوار ترین حاجتوں کو اُس ہستی سے وابستہ کر دینے کے بعد اس پر خدا کی قدرت کا عقیدہ اور بھی مضبوط ہو جاتا ہے۔ اس کی نگاہوں کے سامنے سے شکوک اور شبہات کے دھندھلکے چھٹ جاتے ہیں اور یقین کی شعائیں چمکنے لگتی ہیں اور اس طرح اس کے منتشر خیالات کہیں اور بھٹکنے کے بجائے اپنے معبود حقیقی کے آستانے پر مرکوز ہو جاتے ہیں اور پھر وہ ایسی قوتوں کا حامل ہو جاتا ہے جو اسے کامیابیوں اور کامرانیوں سے سرفراز کر دیتی ہیں۔

دعاؤں کا دوسرا نفسیاتی فائدہ یہ ہوتا ہے کہ جب انسان کی امیدوں اور تمناؤں کے سارے وسیلے ختم ہو جاتے ہیں اور اس کے صبر کی بساط الٹ چکی ہوتی ہے۔ اس کا سکون و قرار غارت ہو چکا ہوتا ہے اور اس کی کامیابیوں کے سارے ذریعہ منقطع ہو چکے ہوتے ہیں اس وقت وہ انتہائی کرب و اضطراب کی حالت میں اپنے معبود حقیقی کو پکار اٹھتا ہے اور دُعاؤں کے لئے اپنے ہاتھوں کو بلند کرتا ہے جو اس کی تسکین کا باعث ہوتا ہے۔ اس پر چھائے ہوئے ناامیدیوں کے بادل چھٹ جاتے ہیں اور اس میں ایک بار پھر سکون اور اطمینان کے ساتھ اپنے منتشر شدہ قوتوں اور وسائل کو مجتمع کرنے اور حوادث روزگار سے کامیابی کے ساتھ ٹکرانے کی قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور اس طرح وہ دُعاؤں کے سہارے پر خود کو ناکامیوں کے عمیق اور تاریک غاروں میں ہمیشہ کے لئے دفن ہونے سے بچا لے جاتا ہے۔

دعاؤں کا تیسرا نفسیاتی فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے ذریعہ سے عبد معبود کا رشتہ استوار اور مضبوط ہو جاتا ہے۔ جب انسان کے سارے مادی اور ظاہری سہارے ختم ہو جاتے ہیں اور اُسے ہر طرف تاریکیاں ہی تاریکیاں نظر آنے لگتی ہیں تو وہ انتہائی

یاس و اُمید کے ساتھ اپنے خالق مطلق کے سامنے سر نیاز خم کر دیتا ہے اور پھر ایک پُر یقین جذبہ کامیابی کے ساتھ اس کے پُر یقین ارادے۔ اس کے خفتہ احساسات اور خوابیدہ جذبات، بیدار ہو اٹھتے ہیں جو اُسے کامیابی کے ساتھ تقرب الٰہی کے اعلیٰ مدارج تک پہنچا دیتے ہیں۔ دعاؤں کا چوتھا نفسیاتی فائدہ یہ ہوتا ہے کہ بندہ میں خدا کی قدرت اور طاقت پر بھروسہ کرنے کا یقینی جذبہ پیدا ہو جاتا ہے جس کے سامنے اُسے خود اپنی قوت سبک اور غیر یقینی لگنے لگتی ہے۔ اور اس طرح اپنی ہر مصیبت سے نجات ملنے کے نتیجے میں اس کا عقیدہ اپنے مالک حقیقی پر بڑھتا ہی رہتا ہے اور اس طرح اس کے معبود برحق پر اس کا بھروسہ بڑھتا چلا جاتا ہے۔ پھر اس کے بعد ہر مصیبت کے وقت اور ہر دشوار گھڑی میں وہ خود کو کسی مصیبت کا سامنا کرنے میں کمزور اور لاغر نہیں محسوس کرتا۔ اس پر اللہ کی بالادستی اور اپنی کم مائیگی کا پختہ یقین سایہ کر لیتا ہے۔

دُعاؤں کا پانچواں نفسیاتی فائدہ یہ ہوتا ہے کہ انسان میں تکبّر اور غرور کا جذبہ ختم ہو جاتا ہے۔ اس کی سرکشی کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ خدا کے سامنے گڑگڑانا۔ اس کے حضور میں دست سوال بلند کرنا۔ اپنی بیچارگی کا اظہار کرنا اس کے جبروتی احساسات کی اصلاح کر دیتا ہے اور پھر اس کی زندگی ایک متقی، پاکباز اور پُرخلوص انسان کے قالب میں ڈھل جاتی ہے۔

خداوند کریم نے اپنے گنہگار بندوں کے لئے توبہ کا دروازہ بند نہیں کیا ہے۔ بلکہ اُسے امیدیں دلائی ہیں کہ تم توبہ کرو۔ میں تمہارے گناہوں کو معاف کروں گا۔ خداوند کریم کی طرف سے دعاؤں کا حکم دیا جانا اور گناہوں سے توبہ کرنے کی نصیحت کا کیا

ان کی رہبری کے سایہ میں دینِ حق اور دین وحدت پر قائم ہوسکے۔

درازیٔ عمر صرف امام عصرؑ کے لئے ہی کوئی نئی بات نہیں ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ بہت سے عام اور بااصول لوگوں کی عمریں بھی طویل ہوئی ہیں۔ لقمان حکیم کی عمر ۳۵۰۰ سال، عوج بن عنق کی عمر ۳۳۰۰ سال اور ذوالقرنین کی عمر ۳۰۰۰ سال کی تھی۔ اسی طرح حضرت نوحؑ کی عمر ۲۵۰۰ سال حضرت آدمؑ کی عمر ۱۰۰۰ سال آخر یہ بھی تو انسان ہی تھے اور ان کی طولانی عمروں کے پیش نظر حضرت امام مہدیؑ کی عمر جو ۱۴۱۶ھ میں محض ۱۱۶۱ سال کی ہوتی ہے ہر طرح سے قابل قبول ہے۔

علم کیمیا CHEMISTRY کے عظیم محققوں اور دانشوروں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ انسانی جسم کے تمام خلیوں CELLS میں ہمیشہ زندہ رہنے کی صلاحیت پائی جاتی ہے بشرطیکہ وہ کسی بیرونی حادثہ یا جرثوموں کے حملوں کا شکار نہ ہو جائے جو اس کے لئے جان لیوا ثابت ہوسکے۔

"پروفیسر ڈائمنڈ برل" نے مسلسل تحقیق وتلاش کے بعد اس حقیقت کو معلوم کیا ہے کہ انسان کے اجزاءِ جسمانی میں ہمیشہ زندہ رہنے کی استعداد پائی جاتی ہے بشرطیکہ کوئی بیرونی حادثہ اس کی زندگی کو ختم نہ کر دے یا جرثوں کا حملہ اسے معطل نہ کر دے۔

"ڈاکٹر ایلکس کارل" نے مسلسل تجربات کے بعد اس بات کو ثابت کر دیا ہے کہ انسان کے جن اعضاء پر تجربات کئے گئے ان میں بڑھاپے کے آثار نظر ہی نہیں آئے۔ اس نے تو یہاں تک ثابت کر دیا کہ جن جانداروں کے یہ اعضاء لئے گئے تجربات کے بعد ان اعضاء کی زندگیاں خود ان جانوروں سے بھی زیادہ پائی گئیں۔ اس سلسلے میں اُس نے ۱۹۱۲ء کے بعد مزید تجربات کئے جن سے مندرجہ ذیل بڑے اہم انکشافات ہوئے۔

(۱) اگر غذائی مواد میں کمی نہ ہو اور اگر جراثیم پیدا نہ ہوں تو یہ خلئے ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔

(۲) جسمانی اجزاء زندہ رہنے کے ساتھ ساتھ بالیدگی کی قوت بھی رکھتے ہیں اور زیادہ تندرست ہوتے رہتے ہیں۔

(۳) ان کی یہ بالیدگی اور نمو ان کو حاصل ہو رہی غذاؤں کی مناسبت سے ہی ہوتی ہے۔

(۴) ان اجزاء پر کہن سالی۔ پیری اور طویل عمری کا کوئی اثر نہیں ہوتا اور عمر کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ نہ تو یہ کمزور ہوتے ہیں اور نہ ضعیف ہوتے ہیں۔ بلکہ سال بہ سال اور بھی تندرست ہوتے ہیں۔ ان سارے حقائق کے پیش نظر اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ پھر انسان کو موت کیوں آتی ہے۔ تو اس کا جواب بھی یہی ہے کہ انسان کے جسم میں بے شمار اعضاء اور اجزاء ہیں جو مختلف اور متزاد ہوتے ہوئے بھی یہ ایک دوسرے سے اس قدر مربوط ہیں کہ ایک کی کمزوری کا دوسرے پر اثر انداز ہونا لازمی ہے۔ کیونکہ ان کی ایک دوسرے سے وابستگی فطری ہے۔ انسان کی موت کی دوسری بڑی وجہ ایسے حادثات بھی ہیں جو کسی ایک یا کئی اجزاء کو بیکار کر دیتے ہیں اور جن کی وجہ سے سارا جسمانی نظام معطل ہو کر رہ جاتا ہے اور موت آجاتی ہے۔ کچھ بیماریاں بھی اس کی ذمہ دار ہیں کہ جراثیم جسم کے بعض اجزاء پر حملہ آور ہو کر اسے ختم کر دیتے ہیں جس کے نتیجے میں اس سے متعلق دوسرے اجزاء بھی مر جاتے ہیں اور انسان کو موت آجاتی ہے یہی وجہ ہے کہ انسان کی متوسط عمر ۷۰ یا ۸۰ سال ہی ہو پاتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اس بات کو واضح کر دینا بھی ضروری ہے ہے کہ انسان کو موت محض اس وجہ سے نہیں آتی کہ وہ ۷۰ یا ۸۰ سال کا ہو چکا ہے بلکہ موت کا اصلی سبب مرض پیدا کرنے والے وہ جرثومے ہیں جو اس کے اجزاء پر حملہ آور ہو جاتے ہیں۔ اور اس طرح ان اجزاء کی کارکردگی بند ہو جاتی ہے۔ اس طرح محض ایک یا

چند اجزاء کے بیکار ہو جانے سے اس سے مربوط اور متعلق اجزاء بھی متاثر ہو کر اپنا کام کرنے سے معذور ہو جاتے ہیں اور آدمی موت کا شکار ہو جاتا ہے۔

اگر میڈیکل سائنس اور کیمسٹری کو اتنا کمال حاصل ہو سکے کہ وہ ان تمام امراض اور دشمن جرثوموں کو ختم کر سکے تو انسان طولانی عمر حاصل کر سکتا ہے۔ علم حیاتیات بھی اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ اگر غذاؤں میں اور دواؤں ضروری احتیاط برتی جائے تو انسان طولانی زندگی بسر کر سکتا ہے۔

اس حقیقت کے واضح ہو جانے کے بعد کہ طولِ عمر محال نہیں ہے تو کیا قادرِ مطلق کے لئے یہ بات ممکن نہیں ہے کہ کسی کو مدّتِ دراز تک زندہ رکھ سکے جب کہ طولانی عمر حاصل کرنے کے رموز۔ شرائط اور طریقے اور ان کی فراہمی اس کے لئے آسان ہے۔ وہ ایک ایسا نظام بنانے پر قادر ہے۔ جو طولِ عمر کے عین موافق اور مطابق ہو۔ ان سب حقائق کے پیش نظر امام مہدیؑ کے طولِ عمر پر کسی طرح کے احتمال یا شبہ کی گنجائش نہیں رہ جاتی ہے

انسان کی زندگی کا تعین اللہ کے پاس ہے۔ اگر وہ کسی کی زندگی کم کرنا چاہے تو محض ایک گھنٹہ یا اس سے بھی کم کر سکتا ہے اسی طرح اگر وہ کسی کی زندگی بڑھانا چاہے تو اُسے لاکھوں برس بھی زندہ رکھ سکتا ہے۔ اور اصحاب کہف اس حقیقت کے زندہ مثال ہیں یا

یہ ایک عالمی حقیقت ہے اور محض عقیدہ کے زیر اثر نہیں ہے۔ غور فرمائیں کہ جب مادّی۔ غذائیں۔ طبّی اور کیمیاوی وسائل سے اجزاءِ انسانی دوام حاصل کر سکتے ہیں اور یہاں تک کہ ان میں رشد و نمو بھی حکمی پائی گئی ہے تو کسی کو دراز عمر عطا کرنے کے مقصد کے لئے خدا ایسے سارے کیمیاوی۔ مادّی۔ طبی اور غذائی وسائل وافر مقدار میں فراہم کر سکتا ہے جو اس کی طول عمری کا ضامن ہو سکے اور یہ بات نہ تو خلاف عقل ہو گی اور

نہ خلاف فطرت ساتھ ہی ساتھ خدا ایسے عوامل بھی فراہم کر سکتا ہے جو طول عمری کے باعث ہو سکیں۔ خزانۂ قدرت میں نہ تو کسی چیز کی کمی ہے اور نہ عوامل کا فقدان۔ اور پھر جب امام عصرؑ کی طویل عمری مرضی الٰہی سے ہی ہے تو پھر اس میں کسی شبہ کی کیا گنجائش ہو سکتی ہے۔

حضرت امام عصرؑ کی طول عمر کے سلسلے میں جو بھی نزاع یا تکرار ہے اس کی اہمیت ایک ریت کی دیوار سے زیادہ نہیں ہے۔ جو یا تو علم کے فقدان۔ یا حقیقت سے انکار اور بے توجہی اور بے اعتنائی کی وجہ سے اور یا تو پھر اس کی سب سے بڑی وجہ آل رسولؐ سے بغض۔ حسد اور دشمنی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کسی کو ملائکہ کی حیات طولانی حضرت خضرؑ کی طویل زندگی۔ حضرت الیاسؑ کی طولِ عمر یا ابلیس کی درازئے حیات پر شبہ کیوں نہیں ہوتا۔ ان کی زندگیوں پر کسی کو اعتراض کیوں نہیں ہوتا۔ اور جب شبہ یا اعتراض پیش کیا جاتا ہے تو امام عصرؑ کی طولِ عمر پر ہی کیا جاتا ہے۔ حضرت ادریس۔ حضرت الیاس۔ حضرت عیسیٰ ہزاروں سال سے زندہ ہیں۔ انھیں خدا رزق بھی فراہم کر رہا ہے۔ حضرت نوح اور جناب لقمان کا تذکرہ ابتدا میں ہی آ چکا ہے۔ ان سب پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا اور اعتراض کیا جاتا ہے تو صرف امام عصر کی زندگی پر اور اس اعتراض کے پس پشت ایک ایسا پُر معاصی اور منافقانہ جذبہ کار فرما ہے جس سے آل محمدؐ سے دشمنی کے ساتھ قدرت خدا پر عدم اعتقاد کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔ اس میں یہ بات بھی یقین کے ساتھ ہی کہی جا سکتی ہے کہ حضرت خضر حضرت الیاس ان دو پیغمبروں کا دَور گذر چکا ہے مگر انھیں زندہ رکھنے کا شاید خدا کا مقصد یہی ہو گا کہ لوگ امام عصر کی طول عمری پر تعجب نہ کریں اور بندگان خدا پر حجت خداوندی

قائم رہے اور زمین نائب رسول، نمائندۂ خدا اور امام زمانہ سے خالی نہ رہے۔

"اور کوئی اہل کتاب ایسا نہ ہوگا مگر ان کی موت سے پہلے ان پر ایمان لے آئے۔"
(۱۵۹۔۴)

اس سلسلے میں رسول اسلام کی ایک مقبول عام حدیث بھی ہے کہ :

"جو اپنے وقت کے امام (امام زمانہ) کو پہچانے بغیر مرا وہ ہلاکت کی موت مرا۔ وہ کافر مرا۔"

آپ یہ بھی غور فرمائیں کہ انبیاء اور صالحین کے لئے ہمیشہ معجزے ہوتے آئے۔ جیسے حضرت ابراہیمؑ کے لئے آگ کا سرد ہو جانا۔ حضرت موسیٰ کے لئے عصا کا اژدہا بن جانا۔ حضرت عیسیٰؑ کے لئے مردہ کا زندہ ہو جانا۔ حضرت محمدؐ کے لئے چاند کا دو ٹکڑے ہو جانا۔ حضرت علیؑ کے لئے آفتاب کا دوبارہ طلوع ہو جانا یہ سب خلاف عقل ہی تو ہیں اور یہ اس بات کے مظہر بھی ہیں کہ خدا کی قدرت موجودہ نظام کائنات پر ہر طرح سے فوقیت رکھتی ہے اور قدرت خداوندی کے پیش نظر امام عصر والزمانؑ کی حیات طولانی پر کسی طرح کی تنقید مناسب نہیں ہے۔

کتابیات

۱) قرآن مجید۔ مترجم و مفسر: مولانا سید مقبول احمد دہلوی

۲) کلام اللہ۔ مترجم: مولانا سید فرمان علی صاحب قبلہ

۳) نہج البلاغہ۔ حکیم ربانی خطیب لاثانی مولانا امیرالمومنین حضرت علیؑ (مترجم: سید انصار حسین ہلالی)

۴) صحیفۂ کاملہ۔ امام رابع مولانا السجاد زین العابدین (مترجم: مولانا مفتی جعفر حسین)

۵) اسلام کے بنیادی عقائد۔ (جلد سوم) حجت السلام سید مجتبیٰ موسوی لاری (مترجم: مولانا روشن علی)

۶) اسلام (دین۔ عقیدہ و عمل) علامہ سید ذیشان حیدر جوادی

۷) چودہ ستارے۔ مولانا سید نجم الحسن کراروی

۸) زندگی۔ موت۔ زندگی مشتاق نقوی

۹) حقائق القرآن۔ سید امتیاز حیدر آختر (پرتاپگڈھی)

۱۰) اصلاح۔ لکھنؤ

Human-Physiology. Vol II. Dr. C.C. Chatterje B.Sc., M.D.

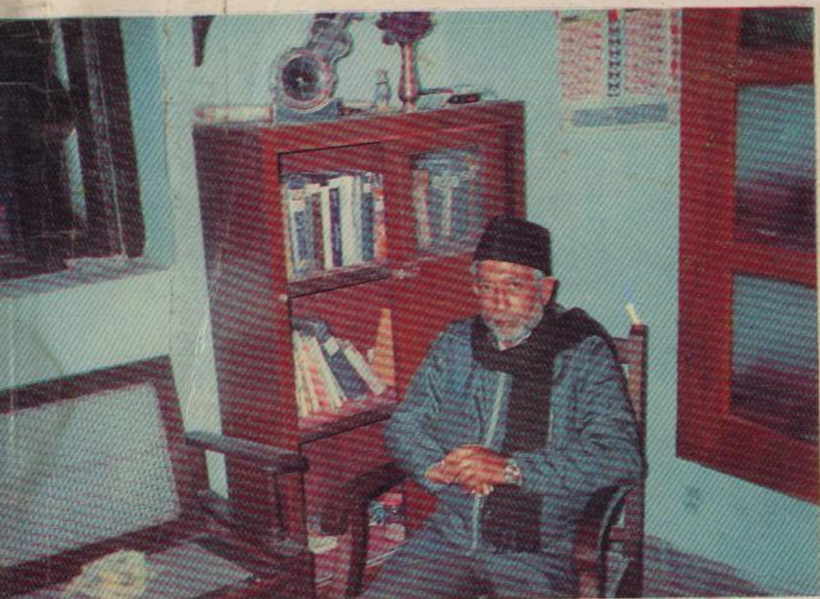
Human-Physiology (Rewised) Dr. G. Deb M.Sc., D.Phil.

B.N. Koley M.Sc., D.Phil.

Churchill-Livingstone Pocket Medical Dictionary

Nancy Roper

The World Book of Encyclopedia Vol 15, 16, 17, 18 & 20



ناشر

عبّاس بُک ایجنسی

رستم نگر، درگاہ حضرت عبّاس لکھنؤ ۳

فون: 260756